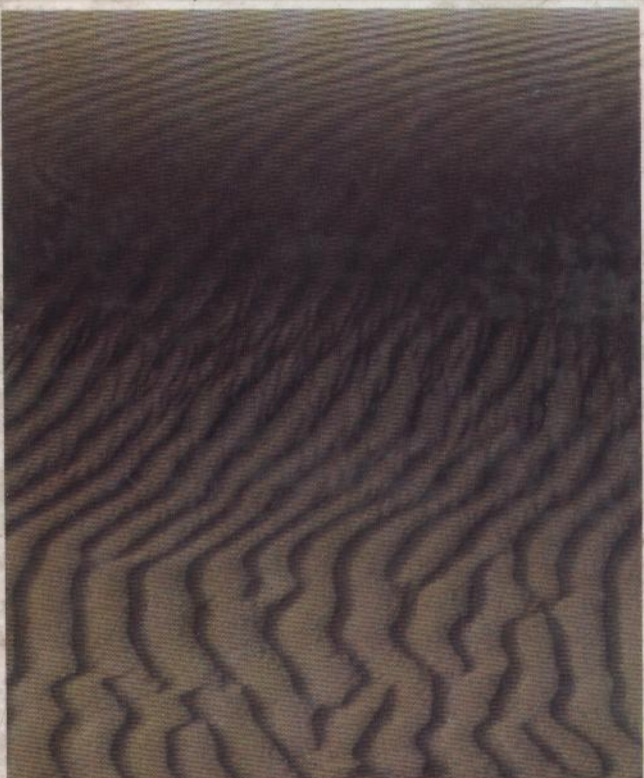
میرے خواب ریزہ ریزہ

احمد فراز



Dost

میرے خواب ریزہ ریزہ

احمد فراز

دوست پبلی کیشنز ۔ اسلام آباد

ضابطہ

ISBN : 969-496-080-0

کتاب	:	میرے خواب ریزہ ریزہ
شاعر	:	احمد فراز
موسم اشاعت	:	۱۹۹۸ء
سرورق	:	ساجد منیر
مطبع	:	الساجد پرنٹرز
قیمت	:	130.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 8 اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958 ، اسلام آباد۔

پہلا منظر

(گھڑیال سات بجاتا ہے اور پھر کسی آباد بازار کی مختلف آوازیں فیڈ اِن ہوتی ہیں۔ اِن آوازوں میں محض کاروں کے ہارن، گھنٹیاں، قہقہے، اور بال رُوم کی موسیقی ہے۔)

بوڑھا: (کھانستے ہُوئے، اپنے آپ سے)

اُف یہ جاڑے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے، — جسم مفلوج ہُوا جاتا ہے
جیسے شریانوں میں تھم جائے لہو کی گردش
یہ بڑھاپا، یہ خزاں کا موسم
دونوں بے رنگ، حرارت سے تہی — دونوں محرومِ تپش

جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنم میں گنہگار بدن کا ایندھن
اب تو اک پیکرِ خاکستر ہوں
زندگی راکھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حدّتِ جاں تاب نہیں دے سکتی
اُف یہ جاڑے کی خنک شام
یہ ٹھنڈے جھونکے
(لہجہ بدل کر) خالدہ !
بند کر دے یہ دریچے کے کواڑ
کتنی بے رحم ہے بیٹی تو بھی
میں چراغِ سحری، اور تجھے
طلبِ بادِ شمال
کیا اِسی دن کے لیے تجھ کو جواں ہونا تھا ؟
(اپنے آپ سے)
کاش اِس دخترِ بے فیض کے بدلے قدرت
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات

بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات !

آمنہ : (قدرے دُور سے — سن رسیدہ آواز)
کیا ہُوا ؟ کیوں بلا وجہ پریشان ہُوئے جاتے ہو ؟
اِک ذرا صبر کرو
آگ روشن کیے دیتی ہوں ابھی
تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو
ایسے مطعون کرو
خالدہ بیٹوں سے بڑھ کر مری پیاری بیٹی
کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے
ہم کہ اب ٹوٹتی گرتی ہُوئی دیواریں ہیں
اس کا معصوم سہارا بھی بہت ہے ہم کو
جو شب و روز جوانی کے تقاضوں کو نچھاور کر کے
ہم پہ قربان ہُوئی جاتی ہے
بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کمر بستہ ہے

بوڑھا : آمنہ ، کتنی کم فہم ہے تُو

تیری کوتاہ نظر
صرف امروز کی مجرم ہے مگر
تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں
آہ میں کیسے کہوں، کیسے تجھے سمجھاؤں
خالدہ کس لیے ہر شام کئی پہروں تک
اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم
اِس دریچے میں کھڑی رہتی ہے

آمنہ : یوں اگر ہے بھی تو پھر
کونسا ظلم ہُوا !
دن بھر اسکول پڑھانا بھی تو کچھ سہل نہیں
نوکری ایک اذیّت ہے، کوئی کھیل نہیں
اور وہ بیچاری تھکن کی ماری
شام کے وقت کبھی اپنے دریچے میں کھڑی
خود کو بہلائے اگر شہر کے نظّاروں سے
تو یہ معصوم سی تفریح بھی ہے جُرمِ عظیم

کتنے بے درد ہیں احسان فراموش ہیں ہم
کتنے ظالم ہیں ستم کوش ہیں ہم
(دھیمے اور اُداس لہجے میں)
خالدہ ! کتنی بدبخت ہے تُو
کتنی بے رنگ ہے معصوم جوانی تیری
تیری قسمت میں نہیں ہے شاید
کہ تری مانگ میں افشاں کے ستارے چمکیں
کہ ترے ہاتھوں میں گلزارِ حنا کے مہکیں
تیری تقدیر میں محنت کے بیاباں ہیں فقط
اور ماں باپ کی بوڑھی لاشیں
ہا بدبخت ہے تُو !
(سسکیاں لینے لگتی ہے ـــــ دُور سے خالدہ کے گنگنانے کی آواز آتی ہے)

بوڑھا : سُن !
سُن یہ آواز کہ ہے اس میں نہاں
تیری بیٹی کا سسکتا فردا

غم فشاں، نوحہ کناں!

خالدہ میری نظر میں بھی ہے معصوم مگر
مجھ کو اس ہنستے ہوئے شہر سے خوف آتا ہے
اس کے ہنگاموں سے رعنائیوں سے
جگمگاتی ہوئی راہوں سے، چمکتے ہوئے بازاروں سے
قہقہوں اور بھٹکتی ہوئی خوشبوؤں سے
اس کے نغموں سے، حسیں رنگوں سے
اس کی دیواروں سے نظاروں سے خوف آتا ہے
تو نہیں جانتی
اِس شہر کی یہ روشنیاں
چھین لے جائیں گی اک روز ترے اور مرے گھر کا یہ ننھا سا یہ معصوم چراغ
آنکھ کا نور، بڑھاپے کا سکوں - خالدہ

(خالدہ کی آواز اُبھرتی ہے)

خالدہ : اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

سورج ڈوب چلا تو کتنے دیپ جلے
شام کے سائے روشنیوں میں ڈوب چلے
یہ خوشبو کے بوجھل جھونکے
یہ کرنوں کی نہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

یہ لوگوں کے ہنستے ارمانوں کے روپ
رات ہوئی تو دمک اُٹھی چہروں کی دھوپ
میرے دل میں کیوں ہے اک
انجانے درد کی لہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

تیرے ہنگاموں کی دنیا نور ہی نور
میرے دھیان میں تاریکی ہے، میں مجبور
میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں
تو امرت یا زہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

(نغمہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے اور موسیقی سے منظر بدلنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے ۔ ہال میں ایک مصوّر کی تصویروں کی نمائش ہے، ہجوم کی ملی جلی آوازوں کے اثرات)

دوسرا منظر

آواز ع۱ : خوب تصویریں ہیں
ع۲ : کتنی ترتیب سے آویزاں ہیں
ع۱ : ہاں کسی فن کی نمائش بھی تو اک فن ہے

ع۲ : ذرا دیکھو تو
ع۱ : اس طرف دیکھو یہ تصویر
ع۲ : "غزالِ صحرا" فن کی معراج ہے یہ ۔ جس طرح قاف کی آوارہ پری ہو کوئی
ع۱ : اے مصوّر ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
ع۲ : خوب تصویر بنائی مرے بہلانے کو
ع۱ : "صبحِ نو"
ع۲ : قابلِ داد ہے ان رنگوں کی آمیزش بھی
ع۱ : کتنے موزوں ہیں یہ باریک خطوط
ع۲ : نور و ظلمت کی کشاکش کا عجب منظر ہے
ع۱ : جس طرح شب کی قبا چاک ہوئی جاتی ہو
ع۲ : آبشار کلۂ کوہ سے گرتا ہوا دریا، توبہ !
ع۱ : کتنی بپھری ہوئی ہر موج نظر آتی ہے
جیسے ہر سنگِ گراں ٹوٹ کے بہہ جائے گا
جو بھی تصویر ہے شہکار ہے، فن پارہ ہے

سلمٰی : ارے زاہدہ تم بھی موجود ہو

زاہدہ: کون ؟ سلمٰی .... یونہی بس چلی آئی تھی

اس مصوّر کے فن سے عقیدت ہے مجھ کو

سلمٰی : بڑی خوبصورت تصاویر ہیں

زاہدہ : واقعی فن کے شہکار ہیں

سلمٰی : جس کو دیکھو وہی نقش پائے مصوّر میں گم، بُت بنا ہے

ارے ! خالدہ اور یہاں

زاہدہ : کیوں اسے دیکھ کر تم کو حیرت ہوئی

سلمٰی : بچاری کی تقدیر میں صرف اسکول ہے اور گھر ہے

زاہدہ : مگر آج تو وہ نمائش میں آئی ہوئی ہے

خدا جانے کیسے بچاری کا مفلوج باپ اور معذور ماں

دونوں اِس کے سہارے پہ زندہ ہیں .....

اور خالدہ خود بھی اس عمر میں فلسفی بن چکی ہے

کہ جیسے کسی اور دنیا کی باسی یہاں آگئی ہو

اِسے آرٹ سے ہے لگاؤ

مگر زندگی کے کسی اور رخ سے محبت نہیں ہے

زاہدہ : بچاری اکیلی کھڑی ہے

چلو اس سے باتیں کریں

سلمٰی : زاہدہ تم نہیں جانتیں

اس کی دنیا اِنھیں سرد تنہائیوں ہی سے آباد ہے

دیکھ لو ایک تصویر کے سامنے کیسے مبہوت ہے

زاہدہ : اور ہاں اس کے ہونٹوں کی جنبش کہ جیسے کوئی خود سے محوِ سخن ہو

سلمٰی : چلو اب چلیں لوگ جانے لگے ہیں

(ہجوم کی آوازیں فیڈ آوٹ ہو جاتی ہیں)

خالدہ : (اپنے آپ سے) یہ تصویر کس شہر کی ہے ؟ سماں

کتنا مانوس ہے

جیسے میری نگاہیں اسے روز و شب دیکھتی ہوں

یہ اُونچی عمارات یہ جگمگاتے در و بام ۔ روشن دریچے

یہ شفاف سڑکیں، بھڑکتے لبادوں میں خوش باش انساں

حسیں رقص گاہوں میں یہ قہقہے، قہقہے

زندگی، روشنی ۔ زندگی، روشنی

اور یہ ایک گوشے کے سائے میں ڈوبا مکاں

نیم وا اک دریچہ

یہ کیوں روشنی کے سمندر کی قربت میں بھی

اِک کرن سے بھی محروم ہے ۔ کیوں؟

نہیں، یہ چمکتا ہُوا شہر ۔

اور یہ اندھیروں میں ڈوبا مکاں

جیسے میرا ہی شہر اور ۔ میرا مکاں ہو

مصوّر

مصوّر! یہ کس کا مکاں ہے؟

مصوّر: یہ کس کا مکاں ہے؟ یہ کس کا مکاں ہے،

مجھے خود نہیں علم یہ روشنی سے چمکتا ہُوا جگمگاتا ہُوا شہر کس کا ہے

اور یہ اندھیرے میں ڈوبا مکاں خود مرے واسطے اجنبی ہے

خالدہ: (چونک کر) کون؟

مصوّر: خاتون! میں ہی وہ مجرم مصوّر ہوں جس کی پریشان تصویر نے آپ

کے ذہن کو اِتنا اُلجھا دیا ہے،

سبھی لوگ میری بنائی ہُوئی ان تصاویر کو دیکھ کر جا چکے ہیں

مگر اُن کی آنکھیں

فقط شوخ رنگوں، چمکتی لکیروں، فسوں کار قوسوں میں کھوئی رہی ہیں

سبھی نے فقط جگمگاتے ہُوئے شہر کا نور دیکھا

مگر بھُول کر بھی کوئی اس اندھیرے مکاں تک نہ پہنچا

یہ سایوں کی دنیا، اندھیروں کا مسکن

مصوّر کا اک نقش نوحہ کناں ہے

یہ ناکام کاوش!

مری ناتمام آرزو اِس ہجومِ فراواں میں بھی

اک نگاہِ کرم کو ترستی رہی ہے

یہ توہین فنکار کی موت ہے

ہاں یہ توہین ۔ فنکار کی موت ہے

خالدہ: مصوّر مگر اس کی ..... قیمت؟

مصوّر : فقط قدر دانی

خالدہ : مرا مدعا ہے ..... اگر میں اسے لینا چاہوں

مصوّر: نہیں یہ ابھی نامکمل ہے

خالدہ : وہ کس طرح ؟

مصوّر: اس اندھیرے مکاں کا دریچہ

ابھی منتظر ہے کسی ایسے پیکر کا
جس کے رگ و پے میں یہ جگمگاتا ہُوا شہر طوفاں اُٹھائے
مگر اس کے قدموں میں ساحل کی زنجیرِ ظلمت پڑی ہو
یہی نور و ظلمت کی پیہم کشاکش
مرے شاہ پارے کو تکمیل کا رنگ دے گی
مجھے اس خیالی ہیولے کی، اس پیکرِ خواب کی جستجو ہے
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

(اپنے آپ میں کھوئے ہُوئے لہجے میں)

یہ خاتون تصویر میں کس قدر کھو گئی ہے

یہ بکھری ہُوئی زلف - جیسے زمانے کا دُکھ اِس پہ سایہ فگن ہو
یہ غمگین آنکھیں - کہ جیسے کسی خواب گوں جھیل میں
دو کنول شامِ ہستی کے کہرے میں لپٹے ہُوئے ہوں
یہ گلنار لب جیسے باغِ جوانی کی کلیاں بہاروں کے انجام سے باخبر ہوں
یہ معصوم چہرہ کہ جیسے کسی جگمگاتے ہُوئے شہر پر دھند سی چھا گئی ہو
مسلسل اُداسی میں ڈوبی ہُوئی نوجوانی
خموشی میں بھی نوحہ گر ہے
یہ پیکر وہی ہے جسے میں نے
مغموم صبحوں میں، خاموش شاموں میں، ویران راتوں میں ڈھونڈا
مجھے مل گیا میرے تاریک و تنہا مکاں کا مکیں
(قریب آتے ہوُئے) اجنبی نیک خاتون ! میں آپ کی قدر دانی کا مشکور ہوں
میرے فن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ میں آپ کی نذر کر دوں یہ تصویر
لیکن اگر آپ کچھ روز اس نامکمل ہیولے کی تکمیل تک ایک زحمت اُٹھائیں

خالدہ : وہ کیسے ؟

مصوّر: مری آرزو ہے کہ میں اس اندھیرے مکاں کے دریچے میں

اس روشنی کی کرن کھینچ لاؤں
جو اس جگمگاتے ہُوئے شہر کی تابناکی سے تابندہ تر ہو
اگر آپ کچھ روز تک شام کو چند لمحے
مرے سامنے آ کے بیٹھیں
تو میں آپ کو اپنی تصویر کے اِس دریچے کی زینت بنا دوں
یہ شاہکار جس دن مکمل ہو — بس آپ کا ہے

خالدہ : مصور — مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے
گر میری موجودگی تیرے فن کے کسی کام آئے
تو میں ...... خواہ کچھ ہو — یہاں روز آتی رہوں گی
ارے شام ڈھلنے کو ہے ...... لوگ سب جا چکے
مجھ کو لازم ہے اب میں بھی جاؤں

مصور : تو کل شام؟

خالدہ : ہاں میں ضرور آؤں گی

تیسرا منظر

(وہی جو پہلے منظر میں ہے)

بوڑھا : آمنہ !
ہو چکی شام مگر خالدہ اسکول سے اب تک نہیں واپس آئی
وسوسے مجھ کو پریشان کیے دیتے ہیں

آمنہ : آج کچھ دیر سے آنے کے لیے اس نے کہا تھا مجھ سے
اس کے اسکول کے پاس
اِک نمائش تھی — وہیں آج اسے جانا تھا
ابھی آتی ہوگی

بوڑھا : ہوں، تو اب
اُس کو بھی اس شہر کی رنگینیاں بہکانے لگیں
آخر اس پر بھی یہ پرچھائیاں اب چھانے لگیں
آہ اس شہر کی یہ روشنیاں !

کتنے معصوم چراغوں کو بجھا دیتی ہیں
کتنے تاریک مکانوں کو لٹا دیتی ہیں
آہ اِس شہر کی یہ روشنیاں !

آمنہ : جانے کیوں واہمے بدظن کیے دیتے ہیں تمھیں
خود سے، ماحول سے، بیٹی سے، سبھی دنیا سے !
واہمے کتنے گناہوں کو جنم دیتے ہیں
آدمی اپنے تراشے ہوئے بُت پوجتا ہے
ہم کہ اب عمر کی اِس منزلِ تاریک میں ہیں
جس میں اک شمع کی موہوم سی ضو
ایک ہلکی سی کرن
خیرہ کر دیتی ہے آنکھوں کو — وہاں
تابِ نظارگیِ مشعلِ خورشید کسے
اپنی محرومی کا احساس ہے، اِس تنگ نگاہی کا سبب
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بوڑھا : ٹھیک کہتی ہو مگر

یہ مرے واہمے وہ تلخ حقائق ہیں جنھیں
میری بے نور نگاہیں ہی فقط دیکھتی ہیں
یہ نظر سوز نظارے یہ بھڑکتے منظر
یہ چکا چوند، یہ جلووں کا ہجوم
رنگ و آہنگ کا طوفان — یہ سیلِ انوار
اک ملمع ہے، نمائش ہے، دکھاوا ہے جسے
اک فسوں کار نے ہر سمت سجا رکھا ہے
ہائے اس سادہ و معصوم نظر کی قسمت
جو فقط ظاہری جلووں سے ہو مسحور مگر
موت کے دام سے بیگانہ رہے
اپنے انجام سے بیگانہ رہے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آمنہ : خالدہ آگئی — بہتر ہے کہ خاموش رہیں

بوڑھا : میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا

چوتھا منظر

مصوّر کا کمرہ، چاروں طرف نامکمل تصویریں بکھری پڑی ہیں، جن پر گرد کی تہہ جم چکی ہے، مصوّر "روشنیوں کے شہر" کی تصویر ایزل پر رکھے اس کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اب اِک تصویر میں تاریک مکان کی جگہ روشن مکان نے لے لی ہے

مصوّر : تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
میرا دل میری تمنّا، مری جاں ہو جیسے
چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کر دوں
زلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کر دوں
حُسن کو پیرہنِ رنگ میں پنہاں کر دوں
جھیل میں پرتوِ مہتاب رواں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

جلوہ افروز ہو پردوں میں بھی افسونِ شباب
جس طرح شیشۂ مے سے نہ چھپے عکسِ شراب
آپ سے آپ کھلے جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب
آمدِ صبحِ بہاراں کا سماں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
کس قدر سادہ و رنگیں ہے جوانی تیری
میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری
ہر مصوّر تری جانب نگراں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ۔ کمرے کا دروازہ کھُلتا ہے اور مصوّر خاموش ہو جاتا ہے)

مصوّر : کون؟ تم خالدہ، آؤ بیٹھو
خالدہ : مصوّر، بڑے خوش نظر آ رہے ہو
کہ جیسے جہاں بھر کی دولت تمھیں مل گئی ہو

مصوّر: بہت خوش ہوں میں، واقعی۔ جس طرح ایک دریوزہ گر کو
کوئی بخش دے ہفت اقلیم کی بادشاہت
خالدہ: ذرا ہم بھی جانیں کہ وہ کون حاتم ہے اور کونسی بادشاہت
ہے جس کے سبب تم وفورِ مسرت سے نغمہ بلب تھے
مصوّر: سخاوت اگر ہو تو ایسی
کہ دستِ کرم اپنی بخشش سے خود بے خبر ہو
مرے سامنے ہیں وہ بخشندہ و بادشاہت
خالدہ: (مسرت سے) مصوّر!
مصوّر: مری نا تمام آرزو آج پوری ہوئی ہے
یہ تصویر میری تمنا کی معراج
دیکھو۔ اندھیرے مکاں کے دریچے میں
یہ روشنی کی کرن۔ کس قدر ضو فشاں ہے
خالدہ: تو کیا یہ اندھیروں میں ڈوبا مرا ہی مکاں تھا
جہاں آج تابانیاں موجزن ہیں؟
مصوّر: نہیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں
یہ ظلمت میں ڈوبا مکاں
ایک فنکار کا غمکدہ، اِک مصوّر کا تصویر خانہ تھا جس پر
زمانے کی بے اِعتنائی کے سائے پر افشاں رہے ہیں
کسی نے تمہارے سوا یہ نہ دیکھا
کہ اس سیلِ رنگ و طرب میں بھی آخر کوئی نوحہ گر ہے
تمہارا کرم تھا کہ تم حسبِ وعدہ
مرے فن کی تکمیل کو میرے ظلمت کدے میں کئی روز تک
روشنی لے کے آتی رہی ہو
خالدہ: تو کیا اے مصوّر، تمہارا مکاں بھی اندھیروں میں گم تھا؟
تو کیا ہر مکاں تیرہ و تار سایوں میں ڈوبا ہوا ہے؟
یہ سب روشنی پھر کہاں کھو گئی ہے؟
کہاں ہے وہ خورشید، وہ منبعِ نور؟
وہ روشنی کا سمندر
کہ جس کے لیے تیرہ و تار دنیائیں شام و سحر منتظر ہیں

مصوّر تمھیں روشنی کی ضرورت نہیں

میرا تاریک گھر اک کرن کو ترستا ہے

اور یہ کرن .... یہ کرن ؟

مصوّر : ہاں تمھاری ہے اور حسبِ وعدہ یہ تصویر حاضر ہے

اب اِس مکاں میں اندھیرا نہیں

یہ بھی اس جگمگاتے ہوئے شہر کا ایک حصّہ ہے

یہ تو وہ تیرگی سیلِ انوار میں گھُل گیا ۔ مِل گیا

روشنی تو ملی ۔ روشنی تو ملی

خالدہ : اچانک تمھاری نگاہوں میں کس سوچ کے دائرے تیرنے

لگ گئے ہیں

یکایک مسرّت کی لہروں میں کن حسرتوں کے بھنور پڑ گئے

جس طرح تم پل بھر میں ہی چھن گئی ہفت اقلیم کی بادشاہت

کہو .... چپ ہو کیوں .... کچھ تو بولو ، مصوّر

مصوّر : نہیں کچھ نہیں ، سوچتا ہوں کہ جب چاند تارے بھی

محتاج ہیں روشنی کے

تو پھر میں اندھیروں کا باسی

کہ جس کے مقدر میں تاریکیاں ہیں اندھیرے ہیں

کیوں آرزوئے ضیا میں ۔ اُجالوں سے شکوہ کناں ہوں

مجھے میری تاریکیاں چاہئیں ، صرف تاریکیاں ، صرف تاریکیاں

مجھے جگمگاتے ہوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا ہے

کہ میں اپنے فن کا گلا گھونٹ کر سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا

مصوّر کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے

اسے جگمگاتے ہوئے شہر سے کیا ؟

تو .... خاتون .... کل شام میں آپ کے شہر کو چھوڑ جاؤں گا

کل شام ، اسی وقت

خالدہ : تو کیا واقعی تم مرے شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟

مصوّر نہ جاؤ .... نہ جاؤ مصوّر ،

مصوّر : مجھے صرف فن سے محبت ہے

شہروں سے ، لوگوں سے ، صبحوں سے ، شاموں سے نسبت نہیں ہے

مجھے آپ سے آپ کا عکس پیارا ہے

جو میں نے خونِ جگر سے سجایا ہے ، روشن کیا ہے
اسی کے لیے میں یہاں چند دن رُک گیا تھا
اور اب جب مکمّل ہے یہ نقش — میں جا رہا ہوں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

پانچواں منظر

(وہی جو پہلا منظر ہے)

بوڑھا : آمنہ ! ہو چکی شام مگر خالدہ گھر آئی نہیں
جانے کیا بات ہے ۔ کیوں آج پریشاں ہے طبیعت میری
آمنہ : ابھی آتی ہو گی
بوڑھا : ابھی آتی ہو گی
اب تو یہ روز کا معمول ہُوا
خالدہ شام سے پہلے کبھی گھر آتی نہیں

اور گھر آئے تو اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتی ہے
نہ اسے باپ کا غم ہے نہ اسے ماں کا خیال
طَور بے طَور ہُوئے جاتے ہیں
اس کے انداز ہی کچھ اور ہُوئے جاتے ہیں
آمنہ : جانے یہ واہمے کب ختم تمھارے ہوں گے
تم کو معلوم تو ہے
خالدہ ان دنوں اسکول میں مصروف بہت رہتی ہے
صبح سے شام تلک
اِک اذیّت میں گرفتار ہے نازک بچّی
بوڑھا : چاہے تم کچھ بھی کہو (تلخ لہجے میں) کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

(خالدہ کے قدموں کی چاپ)

آمنہ : خالدہ آگئی
بوڑھا : کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی
خالدہ : کیا ہُوا ؟

بوڑھا: خالدہ! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

سن لیا؟ کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ: ماں .... مگر

بوڑھا: بس نہیں جاؤ گی تم

آمنہ: لیکن اتنا سوچو

خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر؟

تم بھی معذور ہو.... میں بھی مجبور

دوسرا کوئی سہارا ابھی نہیں

بوڑھا: وائے محرومیٔ تقدیر کہ جس کے باعث

آج میں اپنی جواں بیٹی پر

بار ہوں — بارِ گراں

پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا

خالدہ، باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مری

اتنی تذلیل کرے

اس سے پہلے کہ یہ افلاس مرا

مری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے

میں بجھا دوں گا ہر اک شمعِ حیات

زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں ....

کچھ بھی ہو

مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب

مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب

(شدت سے کھانستا ہے)

موسیقی

(شام کا منظر — گھڑیال سات بجاتا ہے — کسی آباد شہر کا بازار
ہارن، گھنٹیوں، قہقہوں اور بال روم کی موسیقی کے اثرات)

چھٹا منظر

(وہی پہلا منظر — کھڑکی سے روشنیوں کا شہر دکھائی دے رہا ہے —
موسیقی کی آواز لوگوں کے قہقہوں میں گھلتی جا رہی ہے — کرسی خالی ہے
— خالدہ کھڑکی سے لگی کھڑی باہر دیکھ رہی ہے)

خالدہ: (اپنے آپ سے) آہ یہ شام کس درجہ اندوہگیں ہے

مگر آج بھی شہر کا ہے یہ عالم

کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہُوا ہو
وہی روز کے زمزمے، قہقہے، قہقہے جیسے جشنِ طرب ہو
وہی جگمگاتے در و بام، روشن دریچے
وہی رقص گاہوں کے منظر
یہ نغموں کا سیلاب گیتوں کی کرنیں
بھڑکتے لبادوں میں خوش باش رہگیر، خوش بخت پیکر
وہی زندگی روشنی — روشنی زندگی
اور میرا مکاں — اے مصور، یہ تصویر میری نہیں ہے
نہیں .... میری دنیا میں اب تک اندھیرے بسے ہیں
یہاں ظلمتیں اب بھی نوحہ کناں ہیں مصوّر

مصوّر کی خیالی آواز: نہیں تم تو خود روشنی ہو
ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہُوئے ہیں
مجھے جگمگاتے ہُوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا تھا
کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہُوا چھوڑ کر
سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا

مصوّر کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
میں یہ جگمگاتا ہُوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا
کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

خالدہ: مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو
مگر .... ہاں — تمھیں اپنے فن سے غرض
اپنے بے جان رنگوں، ادھوری لکیروں سے
خاموش سایوں سے، ساکن ہیولوں سے اُلفت ہے
تم نقش گر ہو، تمھارے لیے زندگی میں
دھڑکتے دلوں، گنگناتے لبوں، جھلملاتے چراغوں لپکتی شعاعوں میں
کچھ بھی نہیں ہے!
فقط کاغذی بُت، خیالی صنم، سرد لاشیں
تمھاری نگاہوں کے مرکز — مگر بولتی زندگی سے گریزاں

بوڑھا: (خیالی آواز) خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

آمنہ: (خیالی آواز) خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر

تم بھی معذور رہو میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

خالدہ : نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے
میں کب تک یہ لاشیں اُٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں
مری زندگی سرد لاشوں کے بارِ گراں سے سسکنے لگی ہے
مصوّر! مجھے اب تمھاری ضرورت نہیں ہے
کہ تم بھی اسی جگمگاتے ہُوئے شہر کی اک کرن تھے
تمھارا وجود ایک زرتاب ذرّہ تھا جو
اپنے مرکز سے پھر جا ملا
تم بھی اس شہر کے ایک جگنو تھے
جو ان اندھیروں میں اک پل کا مہمان تھا اور بس
اک کرن، ایک جگنو سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
یہ لاشیں
کہ جن کے لیے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
اب وہ بھی مجھ کو فقط باعثِ ننگ گردانتی ہیں

تو کیا وہ مقدس فریضہ مرا جرم تھا جس کی خاطر
میں اک لاش بن کر، اندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں
تو کیا یہ مری زندگی شپّرک کی طرح
تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی
مرے سامنے اک طرف یہ چمکتا ہُوا شہر ہے
روشنی کا سمندر ہے
جو سرد لاشوں سے بیگانہ ہنستی ہُوئی زندگی کا جہاں ہے
اور اک سمت ساحل کی زنجیرِ ظلمت مری آرزوؤں کی قاتل
اُدھر روشنی ــ زندگی
اور اِدھر ــ موت، اور موت کی تیرگی
اگر یہ اُجالے مری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر، موت کی مستقل تیرگی کو نہ کیوں اپنا مسکن بنا لوں؟
میں اِس نور و ظلمت کو اب توڑ دوں گی
فقط موت ہی میری اِس کشمکش کا مداوا ہے
میں توڑ دوں گی یہ زنجیرِ ظلمت، شعاؤں بھرے شہر (دریچے سے چھلانگ لگاتی ہے)

بوڑھا : خالدہ ! خالدہ !

(غمگین موسیقی)

آہ اے شہر، چمکتے ہُوئے ہنستے ہُوئے شہر
کتنا بے رحم ہے سفّاک ہے تُو
تیرے بے خواب دریچوں کے اُجالے جلّاد
تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا، تیغِ ستم
تیرے نغموں کی کھنک، ساغرِ سم
تیری ضوبار عمارات ہیں، مقتل گاہیں
تیری رعنائیاں، آنکھوں کا فریب
یہ ترا حسن ملمّع ہے، نمائش ہے فقط
ریگِ رواں، موجِ سراب !
تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
تُو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
اے چمکتے ہُوئے شہر
اے چمکتے ہُوئے شہر

ساحل
کی
ریت

(سمندر کی لہروں کا خروش —— آبی پرندوں کی صدائیں
—— بعض ساحل نشینوں کی آوازیں اور قہقہے —— دُور
سے دھیمی آوازوں میں ملاحوں کا گیت سنائی دیتا ہے)

سلیمان : (خود کلامی کے انداز میں)

سمندر کی یہ نیلگوں وسعتیں کتنی سحر آفریں ہیں
ہواؤں کی نمناک خوشبو
تھکے ذہن کو کتنی آسودگی بخشتی ہے
سرِ شام
جب جھلملاتی ہے بھیگی ہُوئی روشنی ساحلوں کی
تو کتنے ہی گلرنگ چہرے فضا تاب پیکر سنہرے بدن
چاند تاروں کی مانند اُترتے ہیں

اس تختۂ ریگ پر جس پہ میں بھی کھڑا ہوں
اداس اور تنہا
کوئی بھی تو ان میں نہیں ہے
جو آکر مرے خواب زاروں کے
خاموش و ویراں جزیروں کو دیکھے
جو تنہائیوں کے سمندر میں ڈوبے ہُوئے
بیس برسوں سے اب تک
زمانے کی آنکھوں سے اوجھل
کسی اجنبی چاپ کے منتظر ہیں
اگر کوئی آتا
تو بس — میری تنہائیوں کے سمندر کو
ساحل سے ہی دیکھتا
اور پھر لوٹ جاتا
کسے کیا خبر
کون مجبورِ غم ان جزیروں میں محصور

خوابوں کی دنیا میں نوحہ کناں ہے

کہ میں ایک موج

اور منزل مری ہے حبابِ گریزاں

حبابِ گریزاں تلک کب کوئی موج پہنچی

مسافر کے ہمراہ منزل بھی گرمِ سفر ہے

(سمندری لہروں کا اثر)

مری زندگی تا بکے کہر آلود خوابوں میں ڈوبی رہے گی

مجھے اب یقیں ہو چلا ہے

صداؤں کی شمعیں چمکتی رہیں گی

مگر میری خاموش و تاریک تنہائیوں میں اُجالا نہ ہوگا

اُجالا نہ ہوگا .... اُجالا نہ ہوگا

(لہروں کا صوتی اثر اور وحشیانہ قہقہہ)

ہمزاد : اُجالا نہ ہوگا ....

سلیمان : کون .... تو کون ہے ؟

جو مری سوچ پر خندہ زن ہے

کہ میں تیری آواز سُنتا ہوں لیکن تجھے دیکھ سکتا نہیں

کہ میں تیرے قدموں کی آہٹ سے بھی بے خبر اور تو

میرے خوابوں کی گونجار تک سُن رہا ہے

بتا کون ہے ؟ .... تو کہاں ہے ؟

ہمزاد : مجھے دیکھ سکتی نہیں تیری آنکھیں

مجھے دیکھ سکتی نہیں تیری آنکھیں

مگر میں ترے پاس ہوں

میں ترے ساتھ ہوں

سالہا سال سے

میں تجھے جانتا ہوں

تری سوچ بھی میری نظروں سے مخفی نہیں

میں ازل سے ترا راز داں — تیرا سایہ

مگر ایسا سایہ جو تاریکیوں میں بھی مرتا نہیں

ظلمتوں میں بھی ہمراہ رہتا ہے

میں تیرا ہمزاد

جو ہر قدم، تیری راہوں کے ہر پیچ و خم
تیری سانسوں کے ہر زیر و بم سے شناسا ہوں

سلیمان: اگر تو مرا رازداں ہے
مری تلخ محرومیوں سے ہے واقف
تو کیا پھر یہی ہے شعارِ وفا
ایک محرومِ قسمت کو تسکین دینے کے بدلے
تمسخر کے نشتر چبھوئے
تو کیا بس ترے پاس اک نامرادِ ازل کے لیے
صرف تضحیک کے تازیانے ہیں
ہمدرد آنکھوں کے آنسو نہیں ہیں

ہمزاد: نہیں تو نہیں جانتا
تو کہ تجھ کو کبھی آج تک میری موجودگی
میری قربت کا احساس ہونے نہ پایا
کہ میں تیری آشفتگی پر
تری زیست کی بیکلی پر شب و روز

آنسو بہاتا رہا ہوں
مگر ایک سائے کی وقعت ہی کیا ہے
جو دیوار کے ساتھ رہ کر بھی
گرنے سے اُس کو نہیں روک سکتا
تری زندگی بھی ہے مائل بہ افتادگی
اور میں ایک بے جان سایہ
مگر سُن
یہ آواز
جو زندگی کی صدا ہے
جو میرے لیے میری ہمدردیوں سے سوا ہے
ذرا سُن!

(پس منظر سے مانجھیوں کا گیت اُبھرتا ہے)

رُت طوفانی گہرا پانی قدم قدم منجدھار
تیز ہوائیں دل دہلائیں منزل ہے دشوار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

جیون اک طوفانی ساگر ہر دم موج کے ریلے
تنہائی کا سفر کڑا ہے ساتھ کسی کو لے لے
کس نے اکیلے صدمے جھیلے کون ہُوا ہے پار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

تیرے خوابوں کی دنیائیں دُور بہت دیوانے
راہ میں سانس اُکھڑ جاتی ہے رستے ہیں انجانے
بازو شل ہو جائیں تو کب کام آئے پتوار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

نغمہ فیڈ آوٹ ہو جاتا ہے
طوفانی لہروں کا صوتی اثر

ہمزاد : سُنا تو نے ؟
یہ زندگی کی صدا ہے
جو طوفانِ ہستی میں بھی

کن اداؤں سے نغمہ سرا ہے
یہی تیرے دُکھ کی دوا ہے

سلیمان : نہیں میری محرومیوں کا کوئی بھی مداوا نہیں
اور میں
زندگی کا سفینہ شب و روز کھیتا رہا ہوں
فقط تند لہریں ہی میرا مقدر رہی ہیں
مگر اب مرے دست و بازو بہت تھک چکے ہیں
یہ معمول
دو چار دن کا
برس دو برس کا نہیں
بیس برسوں سے ہر شام
میں اِس سمندر کی بیتابیاں دیکھتا ہوں
یہ موجیں مری آشنا ہیں
میں اِن کے اشارے سمجھتا ہوں
جیسے یہ کہتی ہوں

آؤ — یہیں ہے تمہارے حسیں خواب زاروں کا مدفن
یہاں ایسی گہرائیاں ہیں
کہ جن میں ہمالہ سے کہسار بھی ڈوب جائیں
کہ چشمِ خضر بھی نشاں تک نہ پائے
جہاں اتنی وسعت ہو
اتنی کشادہ دلی ہو
وہاں ایک کمزور انساں
پرِ کاہ سے بھی ہے کم تر
تو پھر کیوں نہ میں
زندگی کا سفینہ
سکوں بخش موجوں میں غرقاب کر دوں

ہمزاد : ٹھہر — یہ ترا وہم ہے
تو کہ خود اپنی تنہائیوں کا ہے محرم
ذرا سوچ کیا تیری دنیا میں کوئی نہ آیا
ذرا بیس برسوں کی گزری ہوئی منزلوں کی طرف

لوٹ کر دیکھ
کیا کوئی دل بھی تری آرزو میں نہ دھڑکا
کوئی زلف بھی تیری خاطر نہ بکھری
کوئی آنکھ ایسی نہ تھی، جس کی پلکوں پہ تیرے لیے
آنسوؤں کے ستارے دمکتے
ذرا سوچ ناداں

یہ سب کچھ تھا لیکن
تری زندگی ایک ساحل کی مانند تھی
جو سدا بحر سے لب بلب رہ کے بھی
مستقل تشنگی کی گلہ مند ہو
سوچ ! اس تشنہ کامی کا باعث
سمندر ہے یا ریگِ ساحل

سلیمان : مگر کون تھا وہ سمندر ؟
مری زندگی تو فقط قلزمِ ریگ ہے

جس میں ہر دم سرابوں کی لہریں ہیں
پانی کی بوندیں نہیں
اور سرابوں کا حاصل
بجز مرگِ تشنہ لبی اور کیا ہے
فقط شوق کی آندھیوں اور تنہائیوں کے بگولوں سے
کب تشنگی بجھ سکی ہے ؟

ہمزاد : اور وہ نبیلہ ؟

سلیمان : نبیلہ .... نبیلہ
نبیلہ تو صحرا کا بادل تھی
جس کا کرم چند لمحوں کا سایہ
بھلا چند لمحوں کے سائے سے برسوں کی حدت کہیں کم ہوئی ہے ؟
نبیلہ کی آواز .... دو چار لمحوں کی گونجار تھی
اور دو چار لمحوں کی گونجار .....

(پس منظر میں گیت اُبھرتا ہے)

بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی
مری زندگی تجھ سے کب آشنا تھی
گھٹائیں اُٹھیں اور ہوا گنگنائی
تڑپتی ہوئی موج ساحل تک آئی
وہ کیسا سماں تھا وہ کیسی فضا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی
بدن میں سُلگتی ہیں چنگاریاں سی
یہی رُت تھی پہلے بھی لیکن جُدا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی
جواں ہیں ابھی خواہشوں کے جزیرے
چلو ہم بھی جائیں ادھر دھیرے دھیرے
کہیں پھر نہ کہنا کہ وہ بے وفا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

نبیلہ : بتا میرے ساتھی ....
مرا گیت سُن کر نہ جانے تمھیں

کیوں خموشی کے گرداب نے آلیا ہے
کہو کیا تمھیں میری آواز سُن کر.....

سلیمان : نبیلہ مجھے تیری آواز سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے
جیسے
مجھے کوئی ایسے جزیروں سے آواز دیتا ہو
جو میرے خوابوں میں آباد ہیں
پر مری آنکھ ان کو نہیں دیکھ سکتی
یہ آواز پل بھر کا جادو
جو کانوں میں رس گھول دے
اور آنکھوں سے بینائیاں چھین لے
جس طرح معبدوں کی سُبک گھنٹیاں یک بیک بج اُٹھیں
اور پجاری
وفورِ عقیدت سے سر کو جھکالیں
مگر اُن کی آنکھیں
دلوں میں بسائے ہوئے دیوتا کی جھلک کو بھی ترسیں

مرے سامنے تُو ہے .... پھر بھی
مرے سامنے تُو نہیں ہے
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
سب واہمہ ہے — یہ سب واہمہ ہے

نبیلہ : سلیماں تمھیں اپنی آنکھوں پہ شاید بھروسہ نہیں ہے
مگر زندگی کی یہ کیفیتیں اتنی سحر آفریں ہیں
کہ خود میں بھی ماحول سے بے خبر ہوں
چلو ان ہی کیفیتوں کے بہاؤ میں بہہ کر
اُفق کے کناروں کو چھُولیں
سلیماں!

سلیمان : نمعلوم کیوں میرا دل مجھ سے کہتا ہے
یہ چند لمحوں کا نشّہ
سلگتی ہُوئی زندگی کے لیے اِک فریبِ حسیں ہے
فقط چند لمحوں کا نشہ
کہ جس کے اُترتے ہی

پھر تلخ محرومیاں مجھ کو ڈسنے لگیں گی
یہ رُت، یہ سماں، یہ سمندر کی بھیگی ہوا
یہ فضاؤں کی خوشبو، یہ تیری صداؤں کے گھنگھرو
فقط خواب کے شعبدے ہیں
فقط خواب کے شعبدے
اور خوابوں پہ کب تک بھروسہ نبیلہ

نبیلہ : یہ دو چار لمحے بھی اس زندگی میں بہت ہیں
جہاں ہر طرف اجنبیت کے سائے ہوں
بیگانگی کے اندھیرے ہوں
واں یہ ملاقات — یہ چند لمحوں کی روشن شعاعیں
بہت قیمتی ہیں
بہت قیمتی — آؤ ہم بھی سمندر کی لہروں کی مانند
اِک دوسرے سے ملیں
اور دو چار لمحوں کی کیفیتوں کو غنیمت سمجھ کر
جُدائی کا احساس تک بھول جائیں

کسے کیا خبر
کل کا دن — اپنے آغوش میں
آج کی شام لائے نہ لائے

سلیمان : یہ لمحوں کی کیفیتیں عارضی ہیں نبیلہ
یہ لہریں
جو اک دوسرے کی تمنّا سے مسحور ہو کر
کبھی آ کے شدّت سے ملتی بھی ہیں تو
فقط ایک پل کے لیے
اور پھر اپنی ہستی بھی کھو بیٹھتی ہیں
فقط عارضی کیفیت کے بہاؤ ہیں
کیا زندگی ہے ؟

نبیلہ : یہی زندگی ہے سلیمان
یہی زندگی ہے
یہی ایک اِک پل تو
برسوں کی پھیلی ہوئی آرزو کی متاعِ گراں ہے

وگرنہ

ازل سے ابد تک اگر کوئی سانسوں کے رشتے ملائے
تو پھر اس کشاکش کی لذّت کہاں ہو
جو اک لہر کو دوسری کی طرف کھینچتی ہے
کناروں کو دیکھو
جو اک دوسرے کے مقابل ہیں
لیکن طلب کی کشاکش سے محروم
ان کے لیے زندگی بے حسی ہے
سکونِ مسلسل کے مارے
فقط حسرت و یاس کی ریگ سے مطمئن ہیں
یہ اپنی ہی زنجیر کے صید ....
یونہی رہیں گے .... ازل سے ابد تک

(سمندری لہروں کا خروش)

ہمزاد : سنا میرے ساتھی
یہی تھی وہ آواز

جو تیری سنسان دنیا میں
لمحہ بہ لمحہ کھنکتی رہی ، اور تو اس کو بھی
واہموں کے کھلونوں کی جھنکار سمجھا
یہ صحرا کا بادل سہی
پھر بھی تُو چاہتا تو
سلگتی ہُوئی تلخ تنہائیوں کے بیاباں میں
برسوں کے دُکھ کی تپش بھول جاتا
مگر جب تری چشمِ سوزاں ہی
ابرِ کرم سے گریزاں رہی تو
کسی کو پھر الزام کیوں دو
تہی دست ساتھی
سوالی کا یہ حق نہیں ہے
کہ وہ اپنے بخشندۂ مہرباں کی عنایت
کو شک کی نگاہوں سے دیکھے

سلیمان : مگر میں نے کس مہرباں کی عنایات کو

شک کی نظروں سے دیکھا
مجھے بھی بتاؤ کہ کس نے مجھے اپنے دستِ کرم سے نوازا
یہ مانا کہ میں دامنِ دل پسارے
سرِ رہگزر مدّتوں تک رہا ایستادہ
مگر کون ایسا سخی تھا
جو میری طلب کو بھی خاطر میں لایا
بتاؤ !

ہمزاد : نبیلہ

سلیماں : نبیلہ بھی اک رہروِ تیز رَو تھی
اسی رہگزر کی ۔ جہاں اَن گنت راہرو
اپنے حسن و مروّت کے نادر خزانے لیے
روز و شب
مست و مغرور ہر دم گزرتے رہے
ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا
جو مری تلخ تنہائیوں اور محرومیوں سے

بھری زندگی کو
مسرت کے دو چار پل بخش دیتا
نبیلہ میں اور دوسرے راہگیروں میں
گر فرق تھا تو بس اتنا
کہ اس کی نگاہوں نے دو چار لمحے
مری بے کسی کا تماشا بھی دیکھا
یہ اس کا کرم ہی سہی
پر تماشائی ، اہلِ طلب کا
بھلا آسرا کب بنے ہیں

ہمزاد : نبیلہ تماشائی تھی .... ہوں
یہی تو بڑی بھول ہے میرے ساتھی
ذرا یاد کر وہ سمندر کی اک شام
جب آخری بار تجھ سے نبیلہ ملی

سلیماں : نبیلہ مجھے آخری مرتبہ کب ملی تھی !
مجھے آخری مرتبہ کب ملی تھی ؟

(لہروں کا تاثر)

ہمزاد : سمندر کی وہ شام
جب کالے بادل یکایک اُمڈ آئے تھے
اور فضا وقت سے پیشتر ملگجی ہو گئی تھی
نبیلہ ترے ساتھ کشتی میں بیٹھی
خموشی سے لہروں کے انداز کو دیکھتی جا رہی تھی

(لہروں کا تاثر اور گھٹا کی گرج)

نبیلہ : یہ کالی گھٹا آج برسے گی
نیلے سمندر کی لہروں کا ہیجان بڑھنے لگا ہے
ہوا تیز تر ہو رہی ہے
سلیماں سفینے کو ساحل کی جانب بڑھاؤ

سلیماں : نہیں آج کی شام ہیبت فزا ہی سہی
پھر بھی طوفاں نہ آئے گا
میں جانتا ہوں
گھٹا کی گرج اور لہروں کا یہ شور

کچھ بھی نہیں ہے
کہ طوفاں کی آمد سے پہلے
طیور ایک مخصوص آواز میں چیختے ہیں
ابھی ایسی کوئی علامت نہیں ہے

نبیلہ : سلیماں
تمہیں کیا خبر کتنے طوفان ایسے بھی ہیں
جن کی آہٹ سے تم آشنا تک نہیں
پرندوں کی آواز سے تم فضاؤں کے تیور تو پہچان سکتے ہو
لیکن دھڑکتے ہوئے دل کی چیخوں سے ناآشنا ہو
وہ طوفاں جو آنے کو ہے
سوچنے کی بھی مہلت نہ دے گا

سلیماں : نبیلہ ..... میں سمجھا نہیں
تیری باتوں کے انداز معمول سے مختلف ہیں
تری گفتگو اجنبیت کا پہلو لیے ہے

نبیلہ : فقط گفتگو ہی نہیں بلکہ خود ہم بھی

اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں

سلیماں : وہ کیسے ؟

نبیلہ : یقیناً ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
اور اب ہم جدا ہو رہے ہیں

سلیماں : مگر میں نے یہ اجنبیت
ملاقات کی اوّلیں شام سے لے کر اب تک نہ محسوس کی
پھر اچانک تمھیں آج کیوں یہ خیال آ گیا ہے

نبیلہ : یہی تو ستم ہے
کبھی تم نے یہ بھی نہ سوچا
کہ میں کون ہوں ؟
کیا ہوں اور میں تمھیں کس لیے ....

سلیماں : مگر میں نے اِس کی ضرورت نہ سمجھی
ہمارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے
کہ ہم دونوں اک شام
ساحل پہ اک دوسرے سے ملے

اور پھر یہ ملاقات
دونوں کا معمول سا بن گیا ہے
مجھے صرف تجھ سے غرض ہے نبیلہ
فقط تیری موجودگی سے
بس اتنا بہت ہے
کہ جب تو مرے سامنے ہو
تو میں تجھ سے باتیں کروں
تجھ کو دیکھا کروں
تجھ کو پوجا کروں
اس پجاری کی مانند
جو مورتی کی پرستش کو ہی
حاصلِ زندگی جانتا ہو

نبیلہ : مگر تابکے ہم میں یہ اجنبیت کی دیوار حائل رہے گی
مری سانس اپنے ہی پیکر میں گھٹنے لگی ہے
تمھیں پتھروں سے عقیدت ہے

خوابوں کی دنیا سے وابستگی ہے
مجھے زندگی کی طلب ہے
سلیماں !
مجھے زندگی کی طلب ہے

(بادل کی گرج اور سمندر کا شور)

ہمزاد : وہی آخری شام تھی اس ستارے کی
جو تیری تاریک دنیا میں جلوہ فشاں تھا
مگر تیری بے التفاتی کے کہروں نے
اُس کی دھڑکتی ہوئی جھلملاہٹ کو دھندلا دیا
ہاں تجھے صرف پرچھائیوں کی تمنّا تھی
پرچھائیوں سے کسے روشنی مل سکی ہے

سلیماں : مگر وہ ....

ہمزاد : بتا کون ہے تیری محرومیوں اور تنہائیوں کا سبب
بول .... تو .... یا نبیلہ

سلیماں : مگر وہ تو کچھ ساعتوں کے لیے میری دنیا میں آئی

ہمزاد : یہی چند لمحے تو برسوں کی تنہائیوں کا سبب ہیں

سلیماں : وہ کیا چاہتی تھی

ہمزاد : عقیدت کے سجدے نہیں ۔ زندگی کے دھڑکتے تقاضے

سلیماں : نہیں یہ تری خود فریبی ہے
وہ .... وہ .... کہاں ہے

ہمزاد : تجھے اس سے اب کیا غرض
اب تری کلبلاتی ہوئی زندگی کا ٹھکانہ
سمندر کی خاموش تہ ہے

سلیماں : نہیں .... اس سے پہلے کہ یہ تند موجیں
مری زندگی کے سفینے کو غرقاب کر دیں
میں اس سے ملوں گا

ہمزاد : مگر سوچ پاگل
اسے تجھ سے بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا
بیس برسوں کی پھیلی ہوئی تیرگی کا زمانہ
اگر اتفاقاً کہیں تم ملے بھی

توکیا تجھ کو اِس کا یقیں ہے

کہ تیری نظر اُس کو پہچان لے گی

سلیماں : اگرچہ بڑھاپے کے بے نُور کہرے نے میری نگاہوں کو دھندلا دیا ہے

مگر میرے کانوں میں اب تک وہ آواز محفوظ ہے

جس کو برسوں کی نا آشنائی بھی پہچان لے گی

(موسیقی — سمندر کی شام کے اثرات)

سلیماں : سمندر کی یہ شام کس درجہ اندوہگیں ہے

مری زندگی کی طرح

سرد، خاموش، ویران

فقط چند ساحل نشیں

وہ بھی کہرے میں لپٹے ہوئے

ایستادہ ہیں

کیا آج کی شام بھی مجھ کو مایوس ہی لوٹنا ہے

آواز : (دور سے) نگینہ ادھر آؤ بیٹی یہ لہریں خطرناک ہیں

بس کنارے پہ کھیلو

سلیماں : یہ آواز کس کی ہے

جس سے مری روح تک گونج اُٹھی ہے

آواز : نگینہ — ادھر آؤ بیٹا

سلیماں : وہی ہے — وہی ہے یہ آواز

میں نے جسے سالہا سال تنہائیوں میں سُنا ہے

یہی ہے مری جستجوؤں کا مرکز

مری آرزوؤں کی دنیا

نبیلہ

وہی قد و قامت

وہی دلنشیں نقش موزوں پیکر

فقط وقت کے شعبدہ گر نے

بالوں کی کالی گھٹاؤں میں کچھ چاندنی گھول دی ہے

— مگر مجھ کو پہچان بھی پائے گی وہ

میں اس کو پکاروں تو کس نام سے

پاس جاؤں تو کیسے

مرے دل کی دھڑکن

خداوند .... کیسے پکاروں

مگر کب تلک یہ کشاکش

یہ لمحہ جو برسوں کے پیہم تجسس کا حاصل ہے

کیسے گنوا دوں .... خداوند

....

خاتون ! ..... (آہستگی سے)

خاتون !! (قدرے بلند آواز سے)

اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میں — اک بات پوچھوں

مرا مدعا ہے مجھے آپ پہچانتی ہیں

خاتون : نہیں تو — مگر آپ کا اس سے مقصد ؟

سلیمان : یونہی — مجھ کو اک گمشدہ چیز کی جستجو تھی

مجھے یہ گماں ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں

خاتون : مجھے ؟

سلیمان : ہاں مگر آپ کی کیا خطا

سالہا سال کا بُعد پل بھر کی قربت سے کب مٹ سکا ہے

خاتون : میں سمجھی نہیں اجنبی — آپ کیا چاہتے ہیں

سلیمان : میں کیا چاہتا ہوں ؟

سمندر کی اُس شام کی یاد

جب آپ اسی اجنبی سے ملی تھیں

خاتون : مگر کب ؟

سلیمان : کئی سال پہلے

ذرا اپنے ماضی کے لمحات کو دھیان میں لا کے سوچیں

تو شاید کسی نقش کو آپ پہچان جائیں

خاتون : نہیں .... مجھ کو کچھ بھی نہیں یاد

کچھ بھی نہیں یاد

(لہجہ بدل کر) اور یاد ہو بھی تو اب اس کی تجدید سے فائدہ !

اجنبی

زندگی ریگِ ساحل کی مانند ہے

جس کے ہر نقش کو وقت کی تند لہریں مٹا ڈالتی ہیں

(لہروں کا شور اور بادل کی گرج)

آواز: نگینہ! گھٹا چھا رہی ہے اندھیرا بڑھا جا رہا ہے

(دُور سے پکارتے ہوئے) چلو گھر چلیں

سلیماں: ہوا تیز ہونے لگی ہے

(اپنے آپ سے) پرندوں کی آواز میں ایک وحشت سی ہے

جیسے طوفان آنے کو ہو

جیسے طوفان آنے کو ہو

زندگی ایک ساحل کی مانند ہے

جس کے ہر نقش کو وقت کی تیز لہریں مٹا ڈالتی ہیں

سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں

سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں

(سمندر کی لہروں کا شور ابھر کر فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)

موم کے پتھّر

بوڑھا: یہ شب کس قدر سرد ہے میرے آقا
سرِ شام ہی سے ہواؤں کا نم
آج بوجھل تھا
ہر سمت پھیلی ہوئی دھند نے
سامنے کے پہاڑوں کو کفنا دیا تھا
پہاڑی پرندوں کی چیخیں بھی
اب برف میں دب چکی ہیں
چلو اپنے کمرے میں آقا

(خود کلامی کے انداز میں)

انگیٹھی میں گو صبح سے آگ روشن ہے، پھر بھی

دسمبر کی یہ رات
شاید
جہنّم کے ایندھن سے بھی گرم ہونے نہ پائے
فریدوں : نہیں
مجھے بیٹھنا ہے ابھی اِس جگہ
جب تلک میرا سینہ
مرے دُکھ کے شعلوں سے دوزخ بنا ہے
بوڑھا : مگر آج موسم بڑا جان لیوا ہے آقا
فریدوں : مجھے زندگی کی ضرورت نہیں
مرا جسم اِس زخم کی زہرناکی سے سن ہو چکا ہے
جو کچھ روز پہلے
مجھے زندگی کی تمنّا نے بخشا
مرے واسطے اب
دسمبر کی یہ برف باری ہو
یا

جون کی چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو ،
ایک سی ہے
بہاروں ــــ خزاؤں
اجالوں ــــ اندھیروں کے رشتے
فقط زندگی سے عبارت ہیں
اور زندگی
بس لہو کی حرارت ہے بابا
بوڑھا : مگر زندگی تو .....
فریدوں : مری زندگی عالیہ تھی
فقط عالیہ
جس سے میرے لہو میں حرارت تھی
خوابوں میں رونق تھی
سانسوں میں تحریک تھی
اور جسے وقت کے سرد و بے مہر ہاتھوں نے
مجھ سے جدا کر دیا ہے
مری زندگی چھن چکی

لُٹ چکی
بجھ چکی ہے
مری زندگی!
بوڑھا : گئے وقت کو کون لوٹا سکا ہے
کبھی جانے والے پلٹ کر بھی آئے
اور آئے تو کب — جب سسکتے ہوئے منتظر
جسم خاشاک کا ڈھیر بن کر
بگولوں کے گرداب میں ڈوب جاتے ہیں
اور اُن کے ذرّے
قیامت تلک اپنے بچھڑے ہوئے پیکروں کو
نہیں ڈھونڈ پاتے
فریدوں : مگر ان کے سائے
مگر اُن کی یادیں
ہمیں آخری سانس تک خوں رُلاتی ہیں بابا
بوڑھا : بجا میرے آقا

مگر وقت کا شعبدہ گر
جو قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی
ہر زخم کو اپنی رفتار سے بھر بھی دیتا ہے آخر
بڑے سے بڑا داغ بھی بھول جاتا ہے انسان
فریدوں : مگر یہ مشیت کا کتنا بڑا ظلم ہے آدمی پر
بوڑھا : نہیں میرے آقا نہیں
یہ تو اُس کا کرم ہے
وگرنہ یہ دنیا
جہاں آنسوؤں اور دکھوں کے ذخیرے ہیں
اور جس جگہ قحط ہے راحتوں کا
ہمیں تلخ یادوں سے جینے نہ دیتی
فراموش کوشی کی نعمت تو قدرت کا احسان ہے ہم پہ آقا
ابھی آپ کی زیست کا نخلِ شاداب
پہلی خزاں سے شناسا ہوا ہے
مگر میں کہ اک سالخوردہ شجر ہوں

مری خشک و بے برگ شاخوں نے
برسوں
کڑے موسموں کے ستم اور طوفان دیکھے
مرا تجربہ ہے
کہ انساں اگر بھول جانے کی قدرت نہ رکھتا
تو میں اور میرے سن و سال کے لوگ دیوانے ہوتے

فریدوں: نہیں — میں نہیں بھولنا چاہتا عالیہ کو
نہ میں بھول سکتا ہوں اُس کو
جواب بھی مرے سامنے ہے
مرے سامنے ہے
وہ دیکھو
ادھر
شہ بلوط اور شیشم کے پیڑوں کی پگڈنڈیوں سے
گزرتی ہوئی دھند میں
روشنی سی بھری ہے

کہ جیسے کسی سیمگوں ابر پارے میں
لپٹا ہُوا چاند
آسودگی سے رواں ہے
یقیناً یہ مانوس سی روشنی
عالیہ ہی کے پیکر کی ہے
جس کو اُونچے پہاڑوں
بلوط اور شیشم کے پیڑوں
بلندی سے گرتی ہُوئی آبشاروں سے
اور آسمانوں کی مانند
چاروں طرف پھیلتی دُھند سے عشق تھا
کس ادا سے
وہ میری طرف آ رہی ہے
اُدھر
عالیہ!
عالیہ!!

بوڑھا: خدا کے لیے آپ خود کو سنبھالیں
یہ سوچیں یہ تنہائیاں
آپ کی زندگی کو جہنّم نہ کر دیں
یہ سب واہمے ہیں
فقط واہمے — صرف آنکھوں کے دھوکے
خیالی ہیولوں سے وابستگی
اور اِن کا تعاقب تو دیوانگی ہے
جنوں ہے
اگر آپ اِس سالخوردہ نمک خوار کی بات مانیں
تو اِن غیر آباد اُونچے پہاڑوں کی وادی کو
کل صبح ہی چھوڑ جائیں
یہاں تلخ تنہائیوں کے سوا اور کیا ہے

فریدوں: یہ سوچیں
یہ تنہائیاں
یہ خیالی ہیولے

یہ اُونچے پہاڑوں کی سنسان وادی
یہی کچھ تو اب زندگی ہے
یہاں دوسروں کے لیے کچھ نہ ہو تو
پر مرے واسطے
ایک دنیا ہے
میری تمنّاؤں خوابوں کی دنیا
یہاں کی فضا عالیہ کی نم آلود آنکھوں کی مانند
سحر آفریں ہے
یہاں کی ہَوا اُس کی سانسوں کی مانند
خوشبو سے بوجھل ہے
نغموں سے پُر ہے
یہاں کے پہاڑوں میں اس کی وفا کی طرح
استقامت ہے
اُس کی محبّت کی مانند وسعت ہے
اُس کی نگاہوں کی صورت بلندی ہے

یہ پھیلتی دُھند اس کے خیالوں کی مانند
دلکش ہے خوابوں میں ڈوبی ہُوئی ہے
یہیں اِسی فضا اِس ہوا میں
مری جنتِ گمشدہ ہے
میں اپنی متاعِ وفا کو یہاں کس طرح چھوڑ جاؤں

بوڑھا: مگر تابکے!
آپ اس وحشت انگیز ماحول میں
کب تلک رہ سکیں گے
یہاں صرف بے جان پتّھر
فقط پا بہ گِل پیڑ
اور ہم سے بے روح انسان ہیں
شہر کی رونقیں ہاؤ ہو — زندگی
آپ کی منتظر ہے
یہاں آپ تُربت کا پتّھر بنے
کب تلک

زندہ لمحوں پہ روتے رہیں گے

فریدوں: یہ سچ ہے
کہ اب میں فقط سنگِ تربت ہوں
اپنی تمنّا کا بے جان سایہ
مگر تم اسی شہر کو لوٹ جانے کو کہتے ہو بابا
جہاں سے مجھے
عالیہ — اِس سکوں بخش بستی میں لائی تھی
تاکہ مرا فن
جو شہروں کی مسموم تہذیب
مصنوعی تابندگی
اور بیمار اقدار کے محبسوں میں
مقیّد تھا
آزاد ہو کر
نئی زندگی سے لہو لے
نئی زندگی، جو پہاڑوں کی صورت

توانا ہے
چشموں کی صورت رواں ہے
چناروں کی مانند
آتش بجاں ہے
اسے میرے فن سے، مری شاعری سے
پرستش کی حد تک محبت تھی — بابا
اُسے میری ہر ایک تخلیق سے
والہانہ عقیدت تھی
وہ چاہتی تھی
کہ میرے قلم سے
وہ شہکار ٹپکیں
جو رہتے جہاں تک رہیں
تا ابد جاوداں
اُسے مجھ سے بڑھ کر مرے فن سے وابستگی تھی
مگر میں

جو الفاظ کے بتکدوں کا تنہا آذر
فقط عالیہ کے تصور میں
اُس کے خد و خال میں
اُس کی قربت کی لذّت میں
گم ہو چکا تھا
خیالوں کے بیکل ہیولے
مری جنبشِ آذری کو ترستے ترستے ہی
دم توڑ دیتے — مگر مجھ کو اُن کی فنا کا قلق تک نہ ہوتا

بوڑھا: میں سمجھا نہیں میرے آقا!

فریدوں: مری زندگی جس طلب کی دہکتی ہوئی آگ میں
روز و شب جل رہی تھی
اُسے عالیہ کی وفا کی گھٹا نے بُجھایا
تو جیسے مرے ہونٹ چپ ہو گئے ہوں
مری روح کے جھنجھناتے ہوئے تار
نغموں کی آغوش میں سو گئے ہوں

اور اک شام جب
عالیہ
طائرِ باد و باراں زدہ کی طرح
راہگیروں کی مشکوک نظروں کے تیروں سے
خود کو بچاتی مرے پاس آئی
تو اُس کی وفادار آنکھوں میں
معمول کی تشنگی کی بجائے
اک افسردگی تھی

عالیہ : فریدوں !
کہو کوئی تخلیقِ تازہ

فریدوں : نہیں
جانے میری طبیعت کو کیا ہو گیا ہے
مرے شوق کا ساز
مدت سے چُپ ہے
نہ نوحہ نہ نغمہ

کہ جیسے مری زندگی کا خلا
تیری قربت سے پُر ہو گیا ہے
خلا — جو مرے فن کی صورت میں
میری سسکتی تمناؤں کو
زندگی کا لہو بخشتا تھا
مگر جیسے اب تو
مری سوچ کی تنگنائیوں میں گاتی ہوئی
درد کی ندیاں خشک و بے آب ہیں
اور خیالوں کے پیاسے پرندے
یہاں سے سفر کر چکے ہیں
مری خواہشوں کا سمندر
تری ذات کے ساحلوں میں گھرا
کس قدر پُر سکوں ہے
اور اب مجھ کو جینا ہے
تیرے لیے — تیری آسودگی کے لیے

فن تو کربِ مسلسل کے اظہار کا نام ہے
کرب کا سحر ٹوٹے
تو بُت ایک بے ڈول پتھر ہے
نغمہ فقط ایک بے کیف آواز
اور شاعری صرف لفظوں کی بے جان سطریں
مری شاعری اب تمھیں ہو
مرے فن کی معراج
اب تم سے بڑھ کر
مری خواہشوں کے لیے کوئی منزل نہیں ہے

عالیہ : تو پھر یوں کہو
وہ فریدوں جو فنکار تھا
جس کے نغموں سے، گیتوں سے، فن سے
مجھے پیار تھا
مر چکا ہے
مجھے جس فریدوں سے وابستگی تھی

وہ خالق تھا
ان شاہکاروں کا
جو زندگی کے دکھوں — راحتوں
آنسوؤں — قہقہوں
ظلم کی شدتوں — درد کی لذتوں
کے امٹ نقش ہیں
نقش گر!
تو نے یہ بھی نہ سوچا
کہ میں تیری تخلیق کے معبدوں میں
فقط اک پجاری کی صورت میں
دیوی نہیں ہوں
مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے
تیری وفا سے نہیں ہے
اجنتا کے غاروں کے نقاش
دشتِ فنا کے مسافر ہوئے

پھر بھی اُن کے
دل و دست کی کاوشیں
جاوداں ہیں
اگر میری قربت مری چاہتوں نے
ترے شوق کو بے زباں کر دیا ہے
اگر میری آواز کی تشنگی نے
تری زیست کا ہر خلا بھر دیا ہے
تو پھر میں وہ قاتل ہوں
جس نے
ترے جسم کو
شہد کے روپ میں
زہر دے کر
فنا کر دیا ہے
مجھے خود سے نفرت ہے لازم
میں قاتل ہوں

قاتل ہوں
قاتل — فریدوں

فریدوں : نہیں عالیہ
تو مری زندگی ہے — مری روح ہے
تجھ سے میری نگاہوں میں تابندگی
میرے دل میں حرارت ہے
پیکر میں جاں ہے
مسیحا!
ترے مہرباں ہاتھ
میرے ہر اک زخم کے چارہ گر ہیں
اگر میری محرومیوں — میری تنہائیوں
میرے سارے دکھوں کی تپش بجھ گئی ہے
تو اِس کا سبب
میری تسکیں پرستی ہے
تیری وفا تو نہیں ہے

مرے مطمئن روز و شب
میری سوچوں کی میٹھی چبھن لے اُڑے ہیں
میں اب لفظ و معنی کی صورت گری کی بجائے
فقط تیری قربت، تری ہمنشینی کی
آسودگی چاہتا ہوں
میں قدرت کے شہکار کے سامنے
اپنے لفظوں کی تخلیق کو
ہیچ گردانتا ہوں
یہی میرے خونِ جگر کا ثمر
میری برسوں کی دیوانگی کا صلہ ہے
مری عالیہ
میرے ماضی میں اور حال میں کس قدر فاصلہ ہے

عالیہ : فریدوں — یہ سب کچھ سہی
پھر بھی اپنی نظر میں — میں مجرم رہوں گی
مجھے بھی ترا قرب

آسودگی بخشتا ہے
مرے واسطے بھی تری انجمن ہیں
وہ سب کچھ ہے جس کے سوا
زندگی اِک خلا ہے
اندھیری گپھا ہے
مگر ہم
اگر صرف لمحات کے جگنوؤں پر
ازل سے ابد تک
سدا رہنے والے اُجالوں کو
قربان کر دیں
تو یہ کس قدر ظلم ہو گا
ترا فن تو صدیوں کی تابندگی کا امیں ہے
جو میری خوشی اور تیری مسرت سے
بڑھ کر مقدس ہے
بڑھ کر حسیں ہے

مری آرزو ہے فریدوں
کہ تو اپنی عظمت کی اُن چوٹیوں پر کھڑا ہو
جہاں سے تجھے ساری دنیا کی آنکھیں
عقیدت سے دیکھیں
مرے روشنی کے فلک بوس مینار!
میری تمنّا کے معیار
میں تجھ پہ نازاں رہوں گی

فریدوں : مرے فن کی معراج !
خوابوں کی تعبیر!!
اگر تیری چاہت کا معیار یہ ہے
تو میں زندگی کا ہر اک پل
ہر اک سرخوشی
ہر تمنّا — تری آرزو پر نچھاور کروں گا
مرا عہد ہے عالیہ
آج سے میرے دل اور مرے ذہن کی سب

حرارت — توانائی
خونِ جگر کی ہر اک بوند!
فن کی بقا کے لیے صرف ہوگی

عالیہ : فریدوں
ترا عہد میری وفاؤں کا ضامن رہے گا

فریدوں : مگر مجھ کو اس شہر کے روز و شب
اس کی ہنگامہ پرور فضا
شور و طوفاں بھری زندگی سے
کہیں دور جانا پڑے گا
جہاں میں سکوں کے سمندر سے
افکار کے ایسے موتی چنوں
جو ترے درخورِ اعتنا ہوں

عالیہ : یہی میں بھی کہنے لگی تھی
یہاں سے فقط تین سو میل کے فاصلے پر
پہاڑوں کے سینے پہ کہسارِ مرجان کے نام کی

ایک بستی ہے

یہ بادلوں اور گھٹاؤں

سلگتے چناروں حسیں آبشاروں

مہکتے ہوئے لالہ زاروں

خوش الحاں پرندوں کی دنیا

کسی وقت میں

آریائی قبیلوں کا مسکن رہی ہے

مگر اب فقط

علم تاریخ کے ماہروں اور اہلِ سیاحت

کی نظروں کا مرکز ہے

تخلیق و تصنیف کے واسطے

انتہائی مناسب رہے گی

گزشتہ کئی ماہ سے میرے ابّو بھی

جو ایک تاریخ داں ہیں

وہیں جاگزیں ہیں

بڑی خوبصورت جگہ ہے

فریدوں : یہ سب کچھ سہی پر .....

عالیہ : تمہیں واں رہائش کی بھی کوئی زحمت نہ ہوگی

فریدوں : مگر .....

عالیہ : میں بھی کچھ روز تک واں چلی آؤں گی

میرے ابّو نے مجھ کو بلایا ہے — جو اپنی تخلیق کے سلسلے میں

ابھی کچھ مہینے وہیں ہیں

فریدوں : تو پھر ٹھیک ہے

کچھ دنوں تک میں اِس شہر سے چل پڑوں گا

عالیہ : تو یہ طے ہوا

فریدوں : ہاں

عالیہ : تو بس ٹھیک ہے اب اجازت

فریدوں : خدا حافظ اے میری دنیا

عالیہ : مسافت بخیر!

(موسیقی)

پروفیسر : مجھے عالیہ نے لکھا تھا
کہ آپ آ رہے ہیں
یہ بستی کم آباد اور پُرسکوں ہے
مجھے شاعری سے زیادہ شغف تو نہیں ہے
مگر عالیہ میری بیٹی کی تحریر سے یہ عیاں ہے
کہ وہ آپ کی شاعری اور فن کی
بڑی معتقد ہے
فریدون : یہ ان کی فقط قدر دانی ہے
ورنہ مرا فن ابھی
اس مقام اور عظمت سے ناآشنا ہے
جو اوروں کی تعریف کا مستحق ہو
پروفیسر : یہاں کی فضا میں وہ جادو ہے
جو اک مؤرخ کو بھی شعر کہنا سکھا دے
(وقفہ دے کر)
مجھے ان پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے

گزرے ہُوئے قافلوں کے
نقوشِ قدم ڈھونڈنے ہیں
مؤرخ تو ماضی میں رہتا ہے
لیکن یہاں حال اتنا حسیں اور زندہ ہے شاعر
کہ میں سوچنے لگ گیا ہوں
یہاں کوئی ماضی نہیں تھا
بہرحال اگر آپ چاہیں تو
جب تک یہاں ہیں
مرے ساتھ ٹھہریں
یہاں آج کل ایک سیّاح بھی
میرے ہمراہ ٹھہرا ہُوا ہے
بہت خوش مزاج اور انوکھے خیالات کا نوجواں ہے
اگر آپ بھی ہوں
تو جنگل میں منگل کا عالم رہے گا
فریدون : کرم گستری

آپ کا قرب میرے لیے عین راحت ہے
پر میں نہیں چاہتا
میری موجودگی آپ کے روز و شب میں مخل ہو
اگر مل سکے تو مرے واسطے ڈاک بنگلہ مناسب رہے گا

پروفیسر: چلیں جس طرح آپ خوش ہوں
یہاں ڈاک بنگلہ بھی خالی پڑا ہے
اگرچہ جگہ پُر فضا ہے مگر پھر بھی تنہائیاں جان لیوا ہیں
کوئی تو ہو، جس سے کچھ دیر کو آدمی گفتگو کر سکے
میں یہاں کچھ مہینوں سے ہوں
اور گاہے بہ گاہے اگر کوئی سیّاح
یا کوہ پیماؤں کا کوئی ٹولہ
ادھر آ گیا تو یہ سب سے بڑی خوش نصیبی ہے
ورنہ یہ جنت ۔۔ جہنم سے بڑھ کر عذاب آفریں ہے
اسی واسطے عالیہ کو بھی میں نے لکھا ہے
کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، کوہ مرجان آئے

فریدوں: بجا یہ مرا بھی تاثر ہے
اتنی کم آباد بستی میں انساں کا ملنا مسیح و خضر
کی ملاقات سے بھی ہے بہتر
تو میں شام تک ڈاک بنگلے سے آجاؤں گا

پروفیسر: ہاں وہ سیّاح بھی جب تلک لوٹ آئے گا
اور خوب محفل رہے گی

فریدوں: بہت خوب

پروفیسر: ٹھہریں، کسی شخص کو آپ کے ساتھ کر دوں

فریدوں: نوازش ۔۔ مرے ساتھ میرا پرانا ملازم بھی ہے
جو یہاں کی ہر اک راہ سے آشنا ہے

پروفیسر: تو پھر شام کو آپ آئیں گے

فریدوں: جی ہاں

(موسیقی)

(قہقہوں کی آواز، پیالیوں کی کھنک)

پروفیسر: چلو اب یہیں بحث کو ختم کر دیں

مؤرخ سے شاعر کا رتبہ بڑا ہے

عالیہ : نہیں یوں نہیں
آپ یہ مانتے ہیں
کہ اِس روز و شب کی مسافت میں جس موڑ پر بھی
اندھیری گھپائیں ملی ہیں
تو تاریخ کی آنکھ پتھرا گئی ہے
مگر شاعری کی نوا تیرگی کی سلیں چیر کر
روشنی کے وہ سیلاب لائی
کہ جس کی چکا چوند کی تاب چشمِ مؤرخ نہیں لا سکی ہے
مؤرخ تو میری نگاہوں میں
اس شپرک کی طرح ہے
کہ جس کا ٹھکانہ
شکستہ در و بام، مدفون آبادیوں اور مسمار قبروں
کے کتبے رہے ہیں
فقط بادشاہوں کے اُجڑے محلات اور مقبروں کے

سن و سال کی یاد — اُس کی متاعِ عمل ہے
ہیون سانگ سے ابنِ خلدون اور بعد تک کے مؤرخ
سبھی صرف حیرت کے ساحل سے بس بے گہر سیپیاں چن سکے ہیں
مگر دُرِّ شہوار — ہومر، سفوکلیس، ملٹن، بین تانگ، فردوسی
اور شیکسپیئر کا مقدر رہے ہیں

پروفیسر: اور سیّاح؟

عالیہ : اتو سیاحت تو اک انفرادی مسرت ہے
جس کا تعلق ہمہ گیر قدروں سے ہرگز نہیں ہے
مجھے کیا، اگر آپ نے نینوا اور بابل کے منظر
اجنتا کے غاروں کی نقّاشیاں، مصر کے
آسماں بوس اہرام، یونان کے سنگ پیکر
عرب کے مقدّس مقامات یا کافرستاں
کی وادی کو دیکھا
مگر کیٹس، خیّام، حافظ، شیلے، بائرن
اور غالب کے شہکار سب کے لیے

دولت مشترک ہیں

اِک ایسی مسرت جو ہر دَور میں ہر کسی کے لیے ہے

فریدون : نہیں یوں نہیں ہے

مؤرخ میں سیاح میں اور شاعر میں جو فرق ہے

وہ بجا — پر کسی ایک کا دوسرے سے تقابل غلط ہے

میں خود ایک شاعر ہوں پھر بھی مؤرخ کے اعلیٰ مقام

اور سیاح کی عظمتِ رہ نوردی سے منکر نہیں

آپ کی گفتگو کچھ دل آزار پہلو لیے ہے

پروفیسر: مجھے بھی یہ کہنا تھا بیٹا — یہ سیاح مہمان ہیں

اور

سیاح : نہیں مجھ کو کوئی شکایت نہیں

اور نہ زعم اور دعویٰ ہے کوئی

سیاحت تو محض ایک تفریح ہے

یہ جُدا بات میں فنِ تخلیق و تحقیق سے اس کو کمتر نہ سمجھوں

پروفیسر: چلو بات کو ختم کر دیں

اور اب عالیہ گرم کافی پلاؤ

فریدون بیٹا کوئی تازہ تخلیق؟

سیاح : ہاں آپ کے فن کی عظمت کے سب معترف ہیں

کوئی نظم؟

(موسیقی)

(چڑیوں اور پرندوں کی چہکار)

عالیہ : فریدون کہو یہ فضا تم کو اچھی لگی؟

فریدون : ہاں بڑی خوبصورت جگہ ہے

یہاں کا سکوں، حسن اور پھر تمھاری رفاقت

مری ذات اور میرے فن کے لیے کیمیا ہے

عالیہ : تمھیں میرے ابّو .....

فریدون : بہت ہی پسند آئے، اُن کی طبیعت کی نرمی، ملنسار لہجہ

محبت بھرا دل

اور اِن سے سوا

اُن کا بے انتہا علم، جس نے اُنھیں ایک نادر معلّم کا رُتبہ دیا ہے

مرے واسطے ان کی قربت بڑی قیمتی ہے

عالیہ : مگر اُن کی آواز میں کتنا دُکھ ہے فریدوں

فریدوں : مجھے بھی یہ محسوس ہوتا رہا ہے

وہ جب بولتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کسی درد کی آگ

لفظوں سے لپٹی ہوئی ہے

عالیہ : یہ دُکھ بیس برسوں سے اُن کو شب و روز

گھُن کی طرح کھا رہا ہے

مری ماں کا دُکھ

جو مجھے یاد تک بھی نہیں ہے

مری عمر مشکل سے جب دو برس تھی

اک ایسی ہی بستی میں اُونچی پہاڑی کی ڈھلوان پر سے

پھسل کر — وہ ہم سے جُدا ہو گئی تھی

مجھے یاد تک بھی نہیں ہے

مگر میرے ابّو اسی دُکھ کو دل سے لگائے سلگتے رہے ہیں

اسی واسطے اُن کو ماضی سے ماضی کی ہر شے سے اُلفت ہے

چاہے وہ تاریخِ عالم کا قصہ ہو یا بُوئے رفتہ کی یادیں

وہ مجھ کو بہت چاہتے ہیں

کبھی بھی نہ میری کسی بات پر ان کی تیوری چڑھی ہے

نہ وہ مجھ سے رُوٹھے ہیں

میں نے بھی ان کی ہر اک بات کو فرض سمجھا

فریدوں : عجب بات ہے عالیہ

ہم بظاہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں جاں کا زیاں جانتے ہیں

اُسی دُکھ کی شدّت

ہمارے شب و روز کے آئنوں کو جِلا بخشتی ہے

یہی دُکھ اگر جسم کا جزو ہو

تو نتیجہ فنا ہے

مگر روح میں رچ سکے تو

اسی پیکرِ آب و گِل کو پیمبر بنا دے

امٹ ، بے کراں ، جاوداں

سیتاح : (داخل ہوتے ہوئے)

ارے تم ابھی تک

یہاں کاغذوں کے پلندوں میں ڈوبے ہوئے ہو

کبھی تو خیالی فضاؤں سے باہر نکل کر

ذرا جاگتی زندگی کے دھڑکتے ہوئے رنگ دیکھو

فضا میں برستی ہوئی برف کا رقص

دیوانہ گر ہے

فریدوں : فضاؤں کا منظر بہت خوبصورت سہی

پر مجھے اِس گھڑی اپنی دنیا سے فرصت نہیں ہے

عالیہ : فریدوں چلو گھوم آئیں

فریدوں : نہیں عالیہ اِس سمے مجھ کو معذور سمجھیں

سیّاح : تو پھر عالیہ آپ آئیں — ہم اُن کے خیالات

میں کیوں مخل ہوں

عالیہ : چلو گھوم لیتے ہیں — اور ہاں فریدوں

ہماری طرف شام کو آؤ گے

ذرا آج ابو سے محفل رہے گی

فریدوں : یقیناً — مگر عالیہ

عالیہ : کیوں فریدوں

فریدوں : نہیں کچھ نہیں، بے ارادہ ہی کچھ کہہ دیا تھا

سیّاح : یہ شاعر عجب لوگ ہوتے ہیں، ہر دم خیالوں میں گم سم

گھڑی میں اُجالے گھڑی میں اندھیرے

(عالیہ اور سیّاح ہنستے ہوئے نکل جاتے ہیں)

فریدوں : (اپنے آپ سے) گھڑی میں اُجالے گھڑی میں اندھیرے

اندھیرے اُجالے

اُجالے اندھیرے

یہی زندگی ہے

کہیں ناچتے تند شعلے

کہیں برف کا رقص جاری

یہ کیوں ایک بے نام سا خوف مجھ پر ہے طاری

مرا وہم میرے خیالوں کی جادوگری ہے

وگرنہ مری عالیہ

میرے خوابوں کی پیکر
کہ جس کی وفادار آنکھوں کو
کوئی کشش بھی نہ بہکا سکی ہے
نہ بہکا سکے گی
اندھیرے اُجالے
اُجالے اندھیرے

(فیڈ آوٹ)

عالیہ : (داخل ہوتی ہے)
فریدوں ابھی تم یہیں ہو
وہاں ہم سبھی منتظر تھے تمھارے
چلو آج کی شام اکٹھے گزاریں
کہ کل کی شعاعِ سحر — کیا خبر
کیا دکھائے
فریدوں : میں سمجھا نہیں عالیہ
عالیہ : بات یہ ہے کہ سیّاح کل جا رہا ہے

فریدوں : مگر یوں اچانک !!
عالیہ : عجب لااُبالی طبیعت ہے اُس کی
وہ کہتا ہے سیّاح دریا ہے جوہڑ نہیں ہے
حقیقی سیاحت تو ملکوں سے شہروں سے ہو کر گزرنا ہے
رکنا نہیں ہے
اگر ایک سیّاح سمجھے
کہ کوئی جگہ اُس کو دل سے پسند آگئی ہے
تو اُس کے لیے بہتری ہے اِسی میں
کہ فوراً وہاں سے وہ چل دے
ہر اک چیز کا حسن بس اجنبیت کی حد تک ہے
چاہے وہ نادیدہ خطّے ہوں یا صورتیں ہوں
مجھے یہ جگہ اور پھر آپ لوگوں کی قربت پسند آگئی تھی
اِسی واسطے میں نے کل کوچ کا فیصلہ کر لیا ہے
فریدوں : چلو — اس کی مرضی
عالیہ : مگر جانے ابّو کو کیا ہو گیا ہے

وہ اِس پر مصر ہیں کہ سیاح کچھ روز تک اور ٹھہرے

فریدوں : مگر کیوں ؟

عالیہ : نمعلوم کیوں .... شاید ابّو کو اُس کی خوش آہنگ و دلچسپ
باتیں
پسند آگئی ہیں ..... اِسی واسطے .....

فریدوں : ہاں کہو

عالیہ : کچھ نہیں

فریدوں : ہاں اِسی واسطے ؟

عالیہ : وہ اُسے مستقل طور پر اپنے یاں .....

فریدوں : عالیہ !

عالیہ : مجھ کو احساس ہے
پر یہ ہونا ہے
ابو یہی چاہتے ہیں
مجھے یاں بلانے سے اُن کا یہی مدعا تھا
کہ میں اُن کی خواہش کی تائید کر دوں

فریدوں : تو گویا تمہیں بھی .....

عالیہ : فریدوں ! تمہیں شاید اُس شام کی گفتگو یاد ہو
میں نے جب بحث کی آڑ میں اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا
مگر پھر بھی ابّو نہ سمجھے
نہ سمجھے کہ وہ بس وہی چاہتے ہیں — جو وہ چاہتے ہیں

فریدوں : مگر تم

عالیہ : اگر اُن کی سب زندگی صِرف میرے لیے
ایک صحرا کی مانند ویراں رہی
ان کی سب خواہشیں، آرزوئیں مری پرورش
میری خوشیوں کی خاطر شب و روز پامال ہوتی رہی ہیں
تو میں کس طرح — کس طرح
صرف اپنے لیے — اپنے معیارِ ذہن و نظر کے لیے
اُن کے دکھ بھول جاؤں

فریدوں : مگر میرے دُکھ عالیہ، میرے دُکھ

عالیہ : تم فسردہ نہ ہو

فریدوں : جیسے میں جاں سے عاری ہوں پتھر ہوں بے حس ہوں
میری کوئی آرزو کوئی خواہش نہیں
پتھروں پر بھی تیشہ پڑے تو صدائیں نکلتی ہیں
چنگاریاں پھوٹتی ہیں
عالیہ : مگر تم تو شاعر ہو شاعر — عظیم اور برتر
جو خود اپنے ناسور دل میں چھپائے ہوئے
دوسروں کے لیے راحتیں ڈھونڈتا ہے
مسیحا ترا فن تو اوروں کو جاں بخشتا
اور خود درد کی دار پر جھولتا ہے
اگر اس جہاں میں سبھی خود غرض ہوں
اگر ہر کوئی اپنے دکھ کو سنبھالے ہوئے
دوسروں کے غموں اور زخموں سے بے گانہ و بے خبر ہو
تو پھر یہ جہاں اک کھنڈر کی طرح
صرف ماتم کو ترسے
فریدوں : مگر عالیہ تم بتاؤ

کہ اب میں کہاں ہوں
مری زندگی میری قوت مری روشنی
اب کہاں ہے
یہ دکھ میری رگ رگ میں
اک زہر سا گھول دے گا
عالیہ : تمھارے ہی الفاظ ہیں
ہم بظاہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں
جاں کا زیاں جانتے ہیں
اِسی دکھ کی شدّت
ہمارے شب و روز کے آئینوں کو جِلا بخشتی ہے
یہی دکھ اگر جسم کا جزو ہو تو نتیجہ فنا ہے
مگر روح میں رچ سکے تو
اسی تودۂ خاک کو اِک پیمبر بنا دے
پیمبر — امٹ ، بے کراں ، جاوداں
فریدوں : نمعلوم تم کس بلندی پہ ہو

اور میں کن نشیبوں میں بکھرا پڑا ہوں
مجھے چھوڑ کر تو نہ جا
میرے فن کی خداوند
میرے قلم کی توانائی
میری مرادوں کی منزل
مرے دل کی آواز

عالیہ : پگلے ترا فن تو گملے کا پودا نہیں
جنگلوں اور پہاڑوں کے سینے کا نخلِ توانا ہے
سرسبز، پُرتمکنت اور قد آور
جسے برف و باراں کے موسم
نہ وحشت بھری آندھیاں کھا سکیں گی
فریدوں ! میں کل جا رہی ہوں
کہاں یہ نہیں جانتی
تم یہ سمجھو کہ میں مر چکی ہوں

فریدوں : مری عالیہ مر چکی ہے !

مری عالیہ مر چکی ہے !!

عالیہ : تری عالیہ مر چکی ہے تری عالیہ
ہاں مگر اک مری آخری التجا ہے
کہ تم اپنے فن کو بلندی کی اُن چوٹیوں تک اُٹھانا
کہ میں جس جگہ ہوں ۔ تمھیں فخر سے اور محبت سے دیکھوں
ترا فن مری زندگی ہے فریدوں ۔ فریدوں ..... فریدوں

آخرِ شب
کے
ہمسفر

رات کا سناٹا کہیں کہیں سے کسی چمگادڑ کے پھڑپھڑانے اور اُلّو کی آواز آجاتی ہے ۔ موسیقی رات کی ہیبت اور ویرانی کا منظر پیدا کرتی ہے۔ وقفوں کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی چاپ کا تاثر یوں دیا جائے جیسے کوئی فوجی پہرہ دے رہا ہو جب کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہے قدموں کی چاپ ایک لحظہ کے لیے رُک جاتی ہے اور پھر جاری ہو جاتی ہے ۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک رہتا ہے۔

پھر اچانک دُور سے ایک نوجوان عورت کی کربناک سسکیاں اور کراہیں سُنائی دینے لگتی ہیں، فوجی بوٹوں کی چاپ رُک جاتی ہے۔ پرندہ پھڑپھڑاتا ہے۔ آندھی کی سیٹیاں سُنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آواز پھر اُبھرتی ہے۔ بہت دُور سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور نوجوان عورت کی کراہیں بین کے انداز میں سنائی دیتی ہیں ۔ فوجی بوٹوں کی آواز رُک جاتی ہے ۔

سپاہی : یہ آواز کیسی ہے
جیسے کوئی شدّتِ کرب سے رو رہا ہو

مگر اس سمے ؟

نصف شب ہو چکی ہے

یہاں کون ہوگا ؟

یہاں کوئی ذی روح میرے علاوہ نہیں

اور یہ چند لاشیں

کہ جن کی حفاظت پہ مامور ہوں میں

کوئی زندہ پیکر

یہاں وادئ مرگ میں کیا کرے گا

یہ خطہ تو کب سے ہے ویراں

یہاں کچھ شکستہ در و بام

اپنے گزشتہ مکینوں کی یادوں میں

مدت سے یونہی کھڑے ہیں

(پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز)

نہیں یہ مرا واہمہ ہے

یہ شب کتنی ہیبت فزا ہے

کہ میں اپنی آواز سے کانپنے لگ گیا ہوں

(خوفزدہ ہنسی ہنستا ہے)

(دور سے رونے کی آواز پھر اُبھرتی ہے)

نہیں واہمہ یہ نہیں

یقیناً کوئی رو رہا ہے

یہ آواز عورت کی ہے

جیسے گھائل پرندے کی زخمی صدا

سننے والے کے دل پر خراشیں لگائے

مگر اِس سمے اِس جگہ ؟

کون ہوگا ؟

یہ لاشیں مرے سامنے پتھروں کی طرح سرد و بے حس پڑی ہیں

یہ لاشیں مرے ملک کے دشمنوں کی

اور اِن کی حفاظت کو میں ہوں

فقط میں

کوئی نوحہ گر ہے نہ ماتم سرا ہے

تو پھر یہ صدا بَین کی
یہ جگر سوز فریاد کس کی ہے ؟
کیسی ہے ؟
کیوں ہے ؟
یہاں تو بجز ایک معبد
کوئی بھی عمارت سلامت نہیں ہے
تو جیسے اِسی میں کوئی ہے
عبادت کا یہ وقت ؟
(سسکی)
لیکن نہیں
یہ تو رونے کی آواز ہے
اور وہ بھی کسی اپسرا کی
چلوں جا کے دیکھوں
مگر شام تک تو
وہاں بھی

فقط چند بے نور شمعیں
شکستہ ظروف
اور مرجھائے پھولوں کی ویران خوشبو تھی
آواز کوئی نہیں تھی
فقط خامشی اور اندھیرا
یہاں تک کہ معبد کی سہمی ہُوئی گھنٹیاں
بے صدا ہو چکی تھیں
تو پھر اِس سمے کون ہے ؟
سحر ہے
یا مرا واہمہ
کیا خبر
کوئی آسیب ہو
کوئی بد روح
جو اپنے پیکر کی فرقت میں
نالہ کناں ہو

مگر میں سپاہی ہوں

اِن واہموں سے مجھے کیا تعلق

میں بُزدل نہیں

خواہ کچھ بھی ہو

میں اس جنونِ فغاں کا تعاقب کروں گا

(پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز)

(قدموں کی چاپ اور سسکیاں اُبھرتی ہیں)

آواز ع۱ : (ہش) سُنو!

ع۲ : جیسے کوئی ادھر آرہا ہے

ع۱ : چلو اب اُٹھو ورنہ ہم بھی نہیں بچ سکیں گے

ع۲ : بھلا مرنے والے کبھی آہ وزاری سے زندہ ہُوئے ہیں

یہاں تک پہنچنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا

مگر ہم تری دُکھ بھری التجا پر یہ تابوت، پرچھائیوں کی طرح

رینگتے رینگتے اِس جگہ لے کے آئے ہیں

یہاں اب گھڑی دو گھڑی کا توقف کھُلی خودکشی ہے

یہ سارا علاقہ تو اب دشمنوں کے تسلط میں ہے

ورنہ معبد بھی

اُٹھو چلو

(بھاری قدموں کی آواز ہر لحظہ معبد کی دہلیز کی سمت

بڑھتی چلی آرہی ہے — سسکیاں بڑھ جاتی ہیں)

تمھیں اس جواں مرگ شوہر کے غم کی قسم اب اُٹھو

ع۲ : چلو ہم چلیں دوسرے راستے سے نکل جائیں ورنہ ....

ع۱ : سنو پاؤں کی چاپ اِدھر ہی کو بڑھتی چلی آرہی ہے

(آواز بڑھتی چلی آرہی ہے ۔ سسکیاں

جاری ہیں۔ دونوں کرداروں کے قدموں

کی چاپ اُبھر کر غائب ہو جاتی ہے۔ بھاری

قدموں کی چاپ رُک جاتی ہے)

سپاہی : کون ہے ؟

(سسکیاں)

کون ہے ؟

(سسکیاں)

(قدموں کی آواز قریب آکر رُک جاتی ہے)

بتا کون ہے تو
بتا ورنہ تیرے لیے میرے پستول کی ایک گولی بھی کافی رہے گی

(سسکیاں)

(پستول بھرنے کی آواز)

(خود کلامی کے انداز میں)

نہیں اتنی جلدی نہیں چاہیے
ذرا روشنی میں اُسے دیکھ لوں

عورت : تو رُک کیوں گئے مار ڈالو مجھے بھی، مجھے بھی،
مجھے زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے
نہ مرنے کا غم ہے
نہ جینے کی خواہش

(سسکیاں)

سپاہی : مگر تو یہاں اِس سمے

ایک ویران معبد میں کیوں رو رہی ہے
تجھے یہ خبر ہے کہ اب اِس علاقے پہ دشمن کا قبضہ ہے
اور کوئی بھی کچھ بھی نہیں جانتا
اِس کا انجام کیا ہو
اور پھر تم تو عورت ہو
ہیں ..... اِس لیے

عورت : قتل کرنے سے گھبرا رہا ہوں
یہی کہنے والے ہو تم
میرے شوہر کے قاتل
مجھے زندہ رہنے کا لالچ نہیں ہے
یہ تابوت، جو میرے خوابوں کا مدفن ہے
میرے جوانمرگ شوہر کے لاشے کا مسکن ہے
اس کو مرے خون کے سرخ پھولوں سے گلنار کر دے
کہ یہ ظلم احسان ہوگا

سپاہی : مگر میں نہیں تیرے شوہر کا قاتل

نہیں جانتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہ تابوت کس کا ہے
میں تو فقط تیرے رونے کی آواز سُن کر ادھر آگیا تھا

عورت : اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہوگا
کہ قاتل تو سب ایک ہیں
ایک سے ہیں
مجھے اِس سے کیا
کس کے خنجر سے گھائل ہُوئی ہوں
مجھے اس سے کیا
کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھُونک ڈالا
وہ خنجر تیرا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو
میں تو گھائل ہُوئی
آگ تُو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
مرا آشیاں تو جلا

سپاہی : ہاں یہ سچ ہے
مگر نیک خاتون

یہ زندگی کا وطیرہ رہا ہے
کبھی لطف کی ساعتیں
اور کبھی ظلم کے روز و شب
اس کے نخچیر سب ہیں
تجھے کیا خبر
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے
ہر کوئی خود کو معصوم گردانتا ہے
یہاں تک کہ قاتل بھی
اور یہ حقیقت بھی ہے
آج میں تیری نظروں میں قاتل ہوں
کیونکہ
میرا جسم مقتول کے وار سے بچ گیا
ورنہ ہم ایک سی نیّتیں لے کے
اِک دوسرے کے مقابل ہُوئے تھے
اگرچہ یہ دُکھ جاں گسل ہے

مگر حوصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں

عورت : حوصلہ

تم تو پتّھر کے ہو اس لیے ہی یہ سب کہہ رہے ہو
تمھیں کیا خبر
میرا دل پھٹ رہا ہے
مری روح غم کے جہنّم میں ڈوبی ہُوئی ہے
مری سانس نشتر کی مانند میرا جگر چیرتی ہے
تمھیں کیوں خبر ہو
تمھیں تو فقط قتل کرنا سکھایا گیا اور بس .....
زخم کی شدتوں سے تمھیں کیا
جبھی تو یہ سفاک الفاظ
ہمدردیوں کی جیسے آڑ میں کہہ رہے ہو

سپاہی : تمھیں اِس کا حق ہے ۔ تمھیں اِس کا حق ہے
کہ تم جس کڑے درد میں مبتلا ہو
مجھے غیر جانو

مگر میری نیت کو شک کی نظر سے نہ دیکھو
مجھے تو فقط اِس قدر تم سے کہنا تھا
تم ایک کمزور عورت ہو
اور وہ بھی تنہا و بے بس
یہ ویران معبد یہ جاڑے کی تاریک شب
اور یہ مخدوش حالات
بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر لوٹ جاؤ
پہر دو پہر بعد اُجالے کے ہوتے ہی
میرے رفیقوں کے دستے یہاں آن پہنچیں گے
اور پھر کسے علم کیا ہو
تمھاری جوانی دُکھوں کے لبادے میں بھی پُرکشش ہے
مجھے تم ریاکار سمجھو کہ غمخوار جانو
تمھیں اِس کا حق ہے
مگر صبح تک میں بھی شاید
تمھاری مدد کر نہ پاؤں

عورت : مجھے اپنے انجام کا غم نہیں
ہاں مگر اس قدر
میرے محبوب کی روح
میرے لیے آسمانوں کی پہنائیوں میں
پریشان ہوگی
اگر تم مرے دادرس ہو
تو پھر اپنے پستول کی لبلبی کو دبا کر
مجھے اس اذیت سے آزاد کر دو
یہ احسان ہوگا تمھارا
مجھے صبح کی روشنی کی ضرورت نہیں ہے
مجھے زندگی کے کسی بھی اُجالے کی حسرت نہیں ہے
مری مانگ کی کہکشاں
بجھ چکی ہے
مجھے اب سہاروں کے جگنو
اُجالے نہ دیں گے (وقفہ)

(وقفہ کے بعد)

تو کیا تم سے اتنا بھی ممکن نہیں ہے
یہی خیر خواہی کا دعویٰ تھا
اب چُپ کھڑے سوچ میں پڑ گئے ہو
تمھارے خیالوں کی پرچھائیاں میری آنکھوں سے مخفی نہیں ہیں
میں سب جانتی ہوں
جبھی تو مجھے تم سے کوئی توقع نہیں ہے
تمھیں کیا، کسی سے بھی کوئی توقع نہیں تھی
کہ دشمن تو دشمن ہی ہوتے ہیں
اُن سے وفا کی توقع عبث ہے

....

تو پھر میرے ہمدرد
جا اور سحر کے اُجالے کے ہوتے ہی
اپنے رفیقوں کے ہمراہ آ کر
مری بے کسی کا تمسخر اُڑانا

مگر میں تجھے یہ بتا دوں
کہ تم سخت مایوس ہو گے
کہ میرے بجائے
یہاں لاش ہو گی

سپاہی : نہیں یوں نہیں
میں تو یہ سوچتا ہوں
کہ اِس نفرتوں کے زمانے میں
اتنی محبت
مجھے تیرے مقتول کی خوش نصیبی پہ رشک آ رہا ہے
اگر کوئی میرے لیے
اس طرح نوحہ گر، مضطرب، خونفشاں ہو
تو میں زندگی موت پر وار دوں
اے وفادار خاتون !
مجھ کو تری چاہتوں نے
ترا معتقد کر دیا ہے

عورت : مری چاہتوں نے ؟
مری چاہتیں
جو فقط آنسوؤں میں پروئی ہوئی ہیں
فقط چند اشکوں کی لڑیاں
تو چاہت کی ضامن نہیں ہیں
مری چاہتیں
خود غرض اور بزدل ہیں
ورنہ
یہ تابوت
تنہائیوں کے کفن میں لپیٹی ہوئی
صرف اِک لاش کا گھر نہ ہوتا
کہ میں اب تلک جی رہی ہوں
مری زندگی ننگِ اُلفت ہے
اِک بدنما داغ ہے
فرقِ انسانیت پر (سسکیاں لیتی ہے)

سپاہی : محبت کی دیوی
تری یہ وفا کتنی ثابت قدم ہے
تری استقامت کے آگے اجل منفعل ہے

....

مگر زندگی کی بہاریں
ابھی اپنے دامن میں خوشبو کے جھونکے لیے ہیں
ابھی تیرے پیکر میں وہ حسن ہے
جس کی شادابیاں مدتوں تک رہیں گی
محبت تو اک جوت ہے
روشنی ہے
ضیا ہے
جو دُکھ کے گھنیرے اندھیروں میں مرتی نہیں
اور اِسے مارنا ظلم ہے قتل ہے

عورت : ہاں مگر یہ ضیاء جس دیے کے لیے تھی
وہ گم ہو چکا ہے

فقط اک دیا اس ضیاء کو سزاوار تھا
اور وہ آج ویران معبد میں ٹوٹا پڑا ہے
محبت کی لو
اس کی بالیں پہ نوحہ خواں ہے

سپاہی : یہ سچ ہے
وفا نام ہے ایک پیکر سے وابستگی کا
مگر تا بکے شمعِ تربت بنی تم سلگتی رہو گی ؟
ابھی کتنے زندہ جہاں روشنی کی کرن کے لیے منتظر ہیں
اُٹھو اِن اندھیری گپھاؤں سے نکلو
کہ تم روشنی ہو

عورت : سپاہی !
مگر شمعِ تربت کو کس نے گھروں میں جلایا
مرے سامنے اب اندھیروں کی دنیا ہے
اور وادیِ مرگ کی خامشی ہے
یہاں اور کچھ دیر تک

ٹمٹماؤں گی
اور جل بجھوں گی
سپاہی : وفا کو حقیر اور ارزاں نہ سمجھو
یہ موتی بڑا قیمتی ہے
اسے خاک میں رول دینا
سراسر ستم ہے
اگر تم سمجھتی ہو یوں جاں گنوانے سے
یہ لاش پھر جی اُٹھے گی ؟
تو پھر شوق سے موت کا زہر پی لو
اگر یوں نہیں تو
یہ دیوانگی ۔ صرف دیوانگی ہے
نہ مقصد نہ حاصل نہ منزل
اُٹھو زندگی کے کئی راستے منتظر ہیں تمھارے
عورت : مگر تم تو دشمن ہو میرے
تمھاری بلا سے

اگر میری ہستی تباہی کے غاروں میں اُترے
تمھیں کیا اگر صبحدم آنے والے سپاہی مجھے
بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالیں
سپاہی : میں دشمن سہی پھر بھی انسان تو ہوں
مرا دل تمھارے دکھوں سے سلگنے لگا ہے
فقط یہ نہیں ہے
کہ تم اک حسیں نوجواں اور مظلوم بیوہ ہو
بلکہ تمھاری وفا اور وابستگی نے
مرے دل کو پگھلا دیا ہے
وگرنہ مرا دل بھی پتھر کا تھا اور پتھر کا ہو جائے گا
جب یہ منظر نظر میں نہ ہوگا
عورت : تم انساں نہیں ہو
فرشتے ہو
ورنہ ظفر مند لشکر کے وحشی سپاہی تو
مفتوح خطے کی ہر چیز کو

نوکِ شمشیر سے تولتے ہیں

تم اُس وقت سے ایستادہ ہو

کچھ دیر کو بیٹھ جاؤ ..... سپاہی

سپاہی : اوہ مجھے یاد آیا

کہ میں سسکیاں سُن کے یہ دیکھنے کے لیے

اِس طرف آگیا تھا

کہ اِس وقت ویران معبد سے

کیسی صدا آرہی ہے

وگرنہ

مرے ذمّے دشمن کی لاشیں ہیں

جن کی نگہداشت کرنا ہے مجھ کو

عورت : (حیرت سے) نگہداشت !

دشمن کی لاشوں کی

وہ کیوں ؟

(ذرا شگفتگی سے) تمھیں اس کا ڈر ہے کہ لاشیں

کہیں پھر سے زندہ نہ ہو جائیں

اور بھاگ اُٹھیں

سپاہی : (ہنستے ہُوئے) نہیں

اس سبب سے نہیں

بلکہ یہ اِس لیے

تاکہ دشمن کہیں موقع پا کر انھیں لے نہ جائے

عورت : اگر لے بھی جائے تو پھر کیا ؟

بھلا تم کو لاشوں سے کیا واسطہ

سپاہی : یہ سب جنگ کے بھید ہیں

تم نہیں جان سکتیں

عورت : مگر اس میں کیا بھید ہے

سپاہی : ایک تو یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو

تو دشمن کی لاشوں کے بدلے میں

اپنے شہیدوں کی لاشیں ہمیں مل سکیں

عورت : اوہ - یہ بات ہے

سپاہی : ہاں مجھے واپس اپنی جگہ پر پہنچنا ہے

عورت : اور میں ؟

سپاہی : تم !

تم یہیں چند لمحے رکو

میں ابھی لوٹ آؤں گا

اور ہاں .....

یہاں سخت سردی ہے تم کپکپانے لگی ہو

مرا کوٹ لے لو

عورت : نہیں باہر اس سے بھی بڑھ کر ہے

تم جاؤ میں تو یہیں ہوں

سپاہی : یہ لو کوٹ اور اوڑھ لو

میں سپاہی ہوں اور اِن کڑے موسموں کا مرا جسم عادی رہا ہے

عورت : ذرا جلد ہی لوٹنا

(سپاہی کے قدموں کی چاپ

فیڈ ان ہو کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(موسیقی)

(سپاہی کے قدموں کی چاپ فیڈ اِن ہوتی

ہے اور مائیک کے قریب آ کر رک جاتی ہے)

سپاہی : (گھبرائی ہوئی آواز میں) غضب ہو گیا

عورت : کیا ہُوا دوست

سپاہی : اِک لاش کم ہے

عورت : تو پھر کیا ہُوا

سپاہی : اُف غضب ہو گیا تم نہیں جان سکتیں

کہ یہ بات کتنی خطرناک ہے

عورت : کس طرح

سپاہی : میری غفلت کے باعث یہ سب کچھ ہُوا

اور اب

اس کی پاداش مجھ کو بھگتنا پڑے گی

عورت : تو پھر

سپاہی : میں نہیں جانتا اِس کا انجام کیا ہو

کہ یہ مجرمانہ تغافل ہے

اور خاص کر حالتِ جنگ میں

اس کی پاداشں

بس موت ہے

عورت : تو میں اس کا باعث بنی ہوں

مرے واسطے ہی تو تم

فرض کو بھول بیٹھے تھے

اور اب

سپاہی : میں جاتا ہوں

جو کچھ بھی ہو صبح تک میں وہیں پر رہوں گا

کہیں باقی لاشیں بھی غائب .....

عورت : سُنو

تم نے میرے لیے یہ کیا

اور اب ایک صورت ہے

تم ..... میرے شوہر کی یہ لاش

باقی کی لاشوں میں رکھ دو

سپاہی : یہ کیا کہہ رہی ہو

مجھے اپنے کانوں پہ شک ہے

عورت : سپاہی

یہی ایک صورت ہے

اور اب تمھیں سوچنے کی ضرورت نہیں

چلو مل کے یہ لاش ہم لے چلیں

سپاہی : لیکن اتنا کرم !

عورت : کچھ نہیں تم چلو۔

وقت کم ہے

چلو۔

(موسیقی)



احمد فراز اردو کے ان جواں فکر شاعروں میں سے ہے جنہوں نے غنائیہ شاعری کی گرتی ہوئی دیوار کو قدیم روایات اور جدید تقاضوں کے دل کش رنگ اور آہنگ سے قابل قدر سہارا دیا ہے۔ فراز کی عشقیہ شاعری میں قرب محبوب سے زیادہ ہنگام جدائی کے مرقعے ملتے ہیں اور یہ بات فراز تک ہی محدود نہیں اردو غزل کا بیشتر سرمایہ فراق کی طویل گھڑیوں کو گننے اور ہجر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے مراحل سے بھرا ہوا ہے۔ فراز کو بھی دنیائے محبت کی اس بے آب و گیاہ اور بے رنگ و نور وادی سے حسب معمول گزرنا پڑا ہے لیکن اس کے ذہن نے جس طرح اس کے اثرات کو قبول کیا اس میں مریضانہ فریاد کی جگہ صحت مندانہ رد عمل ملتا ہے اور وہ اس تنگ و تاریک گوشے میں بھی زندگی کی جھلک دکھاتا ہے۔

قیوم نظر

ISBN : 969-496-080-0